اقبال بہ چشمِ خیر



ڈاکٹر رؤف خیر

اقبال بہ چشم خیر

ڈاکٹر رؤف خیر

IQBAL BA CHASHM e KHAIR

(Criticism)

by

Dr. RAOOF KHAIR

Year of Edition 2017

کتاب کا نام : اقبال بہ چشمِ خیر (تنقید)

مصنف : ڈاکٹر رؤف خیر

پہلا ایڈیشن : 2017

صفحات : 192

قیمت : Rs. 200/-

کمپوزنگ : ہاتف خیری

ملنے کا پتہ : ڈاکٹر رؤف خیر۔ موتی محل، گولکنڈہ حیدرآباد 500008

Dr. RAOOF KHAIR, MOTI MAHAL,GOLCONDA HYDERABAD

9440945645-raoofkhair@gmail.com

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3191,Vakil Street, Kucha pandit, Delhi-6

انتساب

ہمارے کرم فرما

اور

علامہ اقبال کے شیدائی

جناب مقبول رضوی (امریکہ) کے نام

ڈاکٹر رؤف خیر

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اقبال بچشمِ خیر

اردو ادب کے سب سے زیادہ پڑھے لکھے اور مقبولِ خاص و عام شاعر علامہ اقبال ہیں۔ ماہرین اقبالیات نے اقبال میں گوناگوں خوبیاں تلاش کر کے انھیں رحمتہ اللہ علیہ قرار دیا تو کچھ حضرات نے اپنی صلاحتیں ''اقبال کی خامیاں'' ڈھونڈنے میں صرف کیں اور یہ بھی ایک طرح سے اقبال کی بڑائی ہے کہ مخالفین اپنی تسکین کی خاطر اقبال کو ہدفِ ملامت بنا کر خوش ہوتے رہے۔ بعض ایسے سیماب صفت پُر جوش شاعر بھی گزرے ہیں جو خوامخواہ اقبال کے حریف بن بیٹھے اس طرح ان کی فکر اسی ادھیڑ پن میں ضائع ہوتی رہی۔ بعض شاعروں نے اقبال کے تتبع اور اقبال کی نقل بلکہ نقالی میں اپنی عمریں گزار دیں پھر بھی انھیں کچھ حاصل نہ ہوا یہ نقالی کرنے والے بھی دراصل اقبال کی لکیر کے بالمقابل بڑی لکیر کھینچنے کے چکر میں رائگاں ہوتے رہے۔ اسی لیے میں نے اپنے ایک مضمون میں صاف صاف لکھا ہے کہ اقبال کے بعد شاعری کا دعویٰ کرنا نبوت کا دعویٰ کرنے کے برابر ہے زیادہ سے زیادہ اولیائے غزل یا اوصیائے نظم ہو سکتے ہیں۔

اقبال کے بالمقابل بعض شاعر اپنے آپ کو خاتم الشعراء یا شاعر آخر الزماں سمجھیں تو ان کی حیثیت مسلمہ نہیں بلکہ مسیلمہ (کذاب) جیسی ہے۔

اقبال کے عقائد کے تعلق سے بھی میں نے مدلل لکھ دیا ہے۔قاری کو دلیل کے ساتھ اتفاق واختلاف کا پورا پورا اختیار ہے۔ذہن میں رہے کہ میں اقبال کا شیدائی ضرور ہوں، اندھا معتقداور پرستار نہیں ہوں۔

علامہ اقبال کبھی کسی کی مکمل گرفت میں نہیں آتے۔کوئی ان کی نظم کا گرویدہ ہے تو کوئی غزل کا دیوانہ، کوئی ان کے اسرار ورموز میں سرگرداں ہے تو کوئی ان کے پیچھے پیچھے جاوید نامہ کے افلاک کی سیر کرنا چاہتا ہے، کوئی ان کے بانگِ درا پر لبیک کہتا ہے تو کوئی ان کے پیامِ مشرق کو سرآنکھوں پر رکھتا ہے تو کوئی ان کے ارمغانِ حجاز کو حرزِ جان بناتا ہے، کوئی ان کے ضربِ کلیمی کی تاب نہیں لا پاتا تو کوئی ان کے زبورِ عجم سے مست و بےخود ہوتا ہے۔ خودی و بےخودی کے مابین حیران ہوکر اقبال کا قاری ان کی ہمہ جہت حیثیت سے مرعوب ہوجاتا ہے اور جواُن کے سامنے سر اٹھا کر کھڑا ہونا چاہتا ہے وہ خود اپنی نظروں سے گر جاتا ہے۔اقبال کے بالمقابل کچھ مسلیمہ کذاب پیدا بھی ہوں تو اُن کے قلع قمع کے لیے کسی وحشی حربی کا ایک تیر کافی ہوگا۔ایسے بے مثال شاعر کے تعلق سے میں نے اپنے مطالعے کا لب لباب یہاں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

بچوں کی خودی کی تربیت کے لیے اقبال نے جو کچھ بنیادی نظمیں لکھیں وہ بھلے ہی بعض انگریزی نظموں کے خیال سے استفادے پر مبنی ہوں، اقبال نے انھیں اس قدر اپنا لیا کہ وہ طبع زاد لگتی ہیں۔اگر اقبال نے خود ہی نشان دہی نہ کی ہوتی تو ان کے ماخذ تک پہنچنا دشوار ہی ہوتا۔اقبال کو اگر ہم ادبِ اسلامی کا نقیب سمجھیں تو اس میں کوتاہی کیا ہے کہ یہ تو اقبال کے آفاقی شاعر ہونے پر دال ہے کیوں کہ اسلام بجائے خود آفاقی فکر وفلسفہ کا غماز ہے یہ کوئی نام نہاد مسلمانوں کی جاگیر نہیں۔

اقبال نے ہمیشہ خودی کا درس دیا ہے اور ایسی شخصیات کو سلام کیا ہے جنھوں نے خودی سے کام لے کر انقلاب برپا کیا۔ (کامیابی و ناکامی سے ماورا ہو کر) جیسے ٹیپو سلطان اقبال کا ہیرو ہے جس کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے اقبال نے ایک شاہ کار نظم ''شمشیر گم شد'' لکھی جو ان کے کسی مجموعے میں شامل نہیں۔ اس نظم کے عنوان ہی سے ٹیپو سلطان کی تاریخ شہادت نکلتی ہے۔ پانچ اشعار پر مشتمل اس نظم کے آخری شعر میں اقبال نے زندگی و موت کا فلسفہ سمجھا دیا ہے۔

در جہاں نتواں اگر مردانہ زیست

ہمچو مرداں جاں سپردن زندگیست

(منظوم ترجمہ)

جی نہیں سکتا جہاں مردانہ وار

مر تو سکتا ہے وہاں مردانہ وار

اس پوری فارسی نظم کا منظوم اردو ترجمہ ہم نے بھی پہلی بار کیا ہے۔ وہ بھی اس نایاب شاہ کار نظم کے ساتھ اس کتاب میں ملاحظہ فرمایئے۔ سب سے پہلے جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنی خودنوشت ''اپنا گریباں چاک'' میں یہ فارسی نظم شمشیر گم شد پیش کی اور ہم سے پہلے اس کا منظوم ترجمہ بھی کسی نے نہیں کیا۔ توقع ہے کہ اربابِ نظر اس کاوش کی داد دیں گے۔

اقبال کے اسلوب کے ارتقائی منازل دکھانے کی جہاں کوشش کی گئی ہے وہیں ان کے فکر و فن کے گراف کا جائزہ لیا گیا ہے۔ شعری اعتبار سے تو اقبال کی فکر کا گراف اونچا ہی اٹھتا رہا ہے البتہ شعری مد و جزر کی مدلل نشاندہی بھی کی گئی ہے۔

یورپ جانے سے پہلے اقبال کا جو حال تھا وہ بھی بلاکم وکاست بیان کر دیا گیا ہے وہیں ''ضربِ کلیم کا مردِ مسلماں'' میں اقبال کے قرآنی اسلوب Diction سے استفادے کو ایک بالکل نئے زاویے سے دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

اقبال کے فارسی کلام کا ترجمہ کئی شاعروں نے کیا۔ حتیٰ کہ فیض احمد فیض نے بھی ''لالہ طور'' کے چند قطعات کا ترجمہ کیا۔ ناچیز رؤف خیر نے بھی اقبال کے ایک سو ترسٹھ قطعات پر مشتمل لالہ ءطور (پیامِ مشرق) کا منظوم اردو ترجمہ کیا ہے جو ''قنطار'' کے نام سے کتابی شکل میں آچکا ہے۔ اس کا پیش لفظ میں نے خود لکھا تھا جس میں کچھ اہم انکشافات بھی کیے گئے تھے۔ وہ اہم پیش لفظ اور چند منتخب قطعات کے منظوم تراجم قاری کی دل چسپی کی نذر رہیں۔

علامہ اقبال کی نجی زندگی کے بعض اہم گوشوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ جیسے اقبال کی پہلی دوسری اور تیسری شادی کی تفصیلات۔

اقبال کو علم ابجد پر بھی ماشاءاللہ بڑی دسترس رہی ہے۔ انھوں نے جو مختلف اہم شخصیات کے گزر جانے پر تاریخی مادے نکالے وہ بھی اقبال کی ہمہ جہتی کے عکاس ہیں اور یہ اس فن میں دل چسپی رکھنے والوں کے لیے پیش کیے گئے ہیں۔ جن کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے ان کا حوالہ دے دیا گیا ہے۔ اس کتاب کا سب سے اہم مضمون ''اقبال اور مادۂ تاریخ'' ہے۔

بعض مضامین میں کچھ باتیں دہرائی گئی ہیں۔ یہ بھی دراصل قرآنی اسلوب Diction کی پیروی ہے۔ چونکہ یہ مضامین بیس پچیس سال کے عرصے میں مختلف مواقع پر لکھے گئے ہیں اس لیے کہیں کہیں دہرائے ہوئے لگتے ہیں۔

ہندو پاک میں کئی ماہرین اقبالیات ہیں میں تو اقبال کا ایک ادنیٰ طالبِ علم ہوں میں نے اقبال کو اپنے طور پر بچشمِ خیر جیسا دیکھا ہے ویسا پیش کرنے کی کوشش کی ہے، اور اپنے اسلوب Style میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے، رحمتہ اللہ کی کھونٹی پر ٹانگنے کی کوشش نہیں کی۔

اقبالیات سے متعلق میرے بعض لکچرس Youtube پر دستیاب ہیں۔ اقبال شناسی کی محافل میں یہ لکچر دیے گئے ہیں۔ اُن کی ویب سائٹ website

www.mahafil-e-aliya(iqbal shinasi)

speaker Dr. Raoof khair

میں محافلِ اقبال شناسی حیدرآباد کا ممنون ہوں کہ انھوں نے میرے لکچرس کا اہتمام کیا۔

ڈاکٹر رؤف خیر

اقبال اور مادۂ تاریخ

بعض لکھنوی و دہلوی اہلِ زبان اقبال کو پنجابی ہونے کی وجہ سے چشم کم سے دیکھتے تھے مگر اقبال نے زبان و بیان کا پورا پورا خیال رکھ کر یہ ثابت کر دیا کہ وہ کسی سے کم نہیں۔ مسدس کے فارم میں نظمیں لکھیں تو مروجہ روایتی مسدس کے بالمقابل بڑی لکیریں کھینچ کر دکھائیں ان میں شاہ کار مسدس شکوہ و جواب شکوہ ہے۔ حالانکہ اس سے پہلے انیس و دبیر نے بلکہ بیشتر شاعروں نے مرثیے اسی ہئیت مسدس میں لکھے تھے یہاں تک کہ مولانا خواجہ الطاف حسین حالؔی نے مسدس مدو جزر اسلام جیسا بے مثال کارنامہ کر دکھایا جسے سرسید اپنے لیے ''شاہ نیکی'' تصور کرتے تھے۔ مثنویوں کی بہتات کے بالمقابل اقبال نے ''ساقی نامہ'' رکھ کر اس ہئیت کو وقار بخشا۔ نظم و غزل میں اپنی پہچان رکھ دی۔ اقبال کی نظموں کے اشعار ان کی غزلوں کے اشعار ہی کی طرح مقبول خاص و عام ہوئے۔ اپنے استاد آرنلڈ کی یاد میں ''نالہء فراق'' مسدس کی ہئیت میں ہے۔ داغؔ و غالبؔ کو خراجِ عقیدت بھی مرثیے کی ہئیت میں ہیں، سر سید کی لوحِ تربت پر اسی ہئیت میں کارنامہ دکھایا۔ ''تصویرِ درد'' تو پوری قوم ہی کا مرثیہ ہے۔ اس سے پہلے بھی میں نے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ انیس و دبیر وغیرہ نے شہرِ مرثیہ لکھنو کو مسدس کے ذریعے ''اشک آباد'' بنا کر چھوڑا تھا اسے اقبال نے اپنے ''حرفِ خوش آب'' سے سیراب کر دیا۔ مختصر یہ کہ ہر صنف میں اقبال سر و شانہ بلند ہیں یعنی (Head & Shoulders Above)۔

اقبال نے مادۂ تاریخ میں بھی اپنا کمال دکھایا ہے۔ فارسی ادب کے اثر کے تحت اردو میں بھی ہر اہم موقع کے لیے مادۂ تاریخ نکالنے کی روایت قائم ہوئی۔ غالب کے سامنے کسی نے کہا کہ فلاں صاحب کی اپنی تاریخ پیدائش لفظ ''تاریخ'' ہی سے ۱۲۱۱ھ برآمد ہوتی ہے تو غالب نے فوری ایک قطعہ کہتے ہوئے اپنی تاریخ پیدائش کے لیے کہا ''ان کی تاریخ میرا تاریخا'' یعنی ۱۲۱۲ھ۔ مرزا فرحت اللہ بیگ نے اپنی کتاب ''مولوی نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی'' میں یہ واقعہ لکھا ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد نے اپنی اہلیہ محترمہ کی وفات پر ان کی تاریخ وفات ''لہا غفر'' سے نکالی اس پر مرزا فرحت اللہ بیگ کا دل چسپ تبصرہ کتاب میں دیکھ لیجئے گا انھوں نے اپنے استاد ڈپٹی نذیر احمد سے کہا کہ آپ نے اپنی طرف سے بس یہ کیا کہ سرسید کے لیے کہی گئی تاریخ ''غفرلہ'' ۱۳۱۵ھ کے مادۂ تاریخ میں الف کا اضافہ کر کے لہا غفر (۱۳۱۶ھ) کر دیا۔ اور یہ تاریخ تو اس سال ہر مرنے والی پر صادق آئے گی۔

ڈاکٹر محمد یحییٰ جمیل کی ''دریافت'' کے حوالے سے مغلیہ سلطنت کے بانی ظہیر الدین محمد بابر کی تاریخ ولادت ۱۴ر فروری ۱۴۸۳ء مطابق شش محرم یعنے ۶ رمحرم کو ہوئی اور ''شش محرم'' کے الفاظ سے ۸۸۸ھ مادۂ تاریخ برآمد ہوتا ہے جو اس کا سن ولادت ہے۔ تاریخ گوئی کے چند دل کش نمونے یہ بھی ہیں۔ ''جہانگیر از جہاں رفت'' ۱۰۳۶ھ، ''عالم گیر از جہاں رفت'' ۱۱۱۸ھ، (ماخوذ از عالم گیر، ۱۹۴۴ء)

حروفِ ابجد کو ترتیب وار یاد رکھنے کے لیے اہلِ نظر نے انھیں بعض بے معنی سہی الفاظ میں ڈھال دیا ہے جیسے ابجد (۱۔۲۔۳۔۴) ہوز (۵۔۶۔۷) حطی (۸۔۹۔۱۰) کلمن (۲۰۔۳۰۔۴۰۔۵۰) سعفص (۶۰۔۷۰۔۸۰۔۹۰) قرشت (۱۰۰۔۲۰۰۔۳۰۰۔۴۰۰) ثخذ (۵۰۰۔۶۰۰۔۷۰۰) ضظغ (۸۰۰۔۹۰۰۔۱۰۰۰)۔

مادۂ تاریخ کبھی کبھی بڑی آسانی سے اور بڑا دل چسپ نکل آتا ہے مگر کبھی کبھی تد خلہ وتخرجہ سے کام لے کر شاعر حروف کی کمی بیشی کی نشان دہی کر کے مادۂ تاریخ نکالتا ہے

علامہ اقبال نے بڑی آسانی سے بعض مادۂ تاریخ نکالے ہیں۔ ''حریتِ اسلام سرحادثہ ءکربلا'' (رموزِ بے خودی) میں اقبال کہتے ہیں۔

دشمناں چوں ریگِ صحرا لاتعد

دوستانِ او بہ یزداں ہم عدد

اقبال نے ''یزداں'' کے ہم عدد دوست کہہ کے ابجدی معما پیش کیا تھا۔ ''یزداں'' کے اعداد بہتّر (72) ہوتے ہیں۔ اس شعر کا منظوم ترجمہ کرتے ہوئے مترجم اقبال جناب سید احمد ایثار نے اپنی کتاب ''اسرار ورموز'' میں اس معمے کو کھول دیا

ریت کے مانند دشمن بے شمار

ان کے ہمراہی بہتّر جاں نثار

اپنی خودنوشت سوانح حیات ''اپنا گریباں چاک'' مطبوعہ سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور 2006ء کے باب ''نامعلوم منزل کی طرف'' میں ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال نے انکشاف کیا ہے کہ علامہ اقبال نے سری رنگا پٹنم کے مقام پر شیر میسور ٹیپو سلطان شہید کے مزار کی زیارت کی تھی تو پانچ شعر کی ایک نظم لکھی تھی جس کے عنوان ''شمشیر گم شد'' سے ٹیپو سلطان کی شہادت کا سن ۱۲۱۴ھ مطابق ۱۷۹۹ء برآمد ہوتا ہے۔ یہ فارسی نظم علامہ اقبال کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ یہ تاریخی نایاب نظم راقم الحروف (رؤف خیر) کے منظوم اردو ترجمہ کے ساتھ اربابِ نظر کی نذر ہے۔

آتشے در دل دگر بر کردہ ام
داستانے از دکن آوردہ ام

میرے دل میں اک حرارت بھر گئی
یہ دکن کی داستاں کیا کر گئی

در کنارم خنجرِ آئینہ فام
می کشم او را بتدریج از نیام

کانچ سا خنجر مرے پہلو میں ہے
دھیرے دھیرے میان سے کھینچوں اسے

نکتہ ء گویم ز سلطانِ شہید
زاں کہ ترسم تلخ گردد روزِ عید

مجھ سے کہتے تھے یہ سلطانِ شہید
ڈر ہے، سن کر تلخ ہو گی تیری عید

پیشتر رفتم کہ بوسم خاکِ او
تا شنیدم از مزارِ پاکِ او

مس ہوئے جب لب مرے اُس خاک سے
اک ندا آئی مزارِ پاک سے

درجہاں نتواں اگر مردانہ زیست
ہم چو مرداں جاں سپردن زندگیست

جی نہیں سکتا جہاں مردانہ وار
مر تو سکتا ہے وہاں مردانہ وار

علامہ اقبال

ڈاکٹر رؤف خیر

اس نظم کے آخری شعر میں ٹیپو سلطان شہید کے حوالے سے خودی و جہاد کا پورا فلسفہ اقبال نے پیش کر دیا ہے اس کا ترجمہ بھی اس قدر خوب صورت ہو گیا ہے کہ اگر اقبال زندہ ہوتے تو ضرور پسند فرماتے۔ خاص طور پر آخری شعر کا منظوم اردو ترجمہ۔

اقبال نے اپنے استاد داغ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ایک درد انگیز نظم کہی تھی جو ''بانگِ درا'' میں شامل ہے۔ اقبال کی ذہانت کا اندازہ لگایئے کہ انھوں نے داغ کی تاریخ وفات ان کے نام ہی سے نکالی یعنی ''نواب میرزا داغ'' جس سے ۱۳۲۲ھ برآمد ہوتا ہے

چل بسا داغ آہ میت اس کی زیب دوش ہے

آخری شاعر جہان آباد کا خاموش ہے

داغ ۲۵رمئی ۱۸۳۱ء کو دہلی میں وزیر خانم کے ہاں پیدا ہوئے اور ۱۴رفروری ۱۹۰۵ء کو حیدرآباد میں انتقال کیا اور یہیں درگاہ یوسفین کے احاطے میں دفن ہیں۔ انتقال کے وقت داغ کی عمر چوہتر (۷۴) سال تھی۔ گلزار داغ، مہتابِ داغ، فریاد داغ، یادگارِ داغ ہیں۔

علامہ اقبال نے ابتدا میں عربی و فارسی کی تعلیم مولانا سید میر حسن سیالکوٹی سے حاصل کی۔ شمس العلماء کے خطاب کے لیے جب اقبال نے میر حسن کی سفارش کی تو انگریز آفیسر نے میر حسن کی تصنیفات دریافت کی تھیں تب اقبال نے اس سے کہا تھا کہ میں ہی ان کی تصنیف ہوں۔ اس طرح انھیں شمس العلماء کے خطاب سے سرفراز فرمایا گیا۔ میر حسن کی وفات پر اقبال نے "وما ارسلنك الا رحمته للعالمين" سے ان کی تاریخ وفات 1348ھ نکالی۔

ظہیر دہلوی کہتے ہیں کہ غدر کے وقت ان کی عمر لگ بھگ بائیس سال کی تھی۔ اس طرح ان کی تاریخ پیدائش ہوتی ہے۔ 1835=(22-1857)

ظہیر کے والد سید جلال الدین حیدر المخاطب بہ صلاح الدولہ مرصع رقم خوش نویسی میں بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے استاد تھے۔

حیدر آباد میں یمین السلطنت مہاراجہ کشن پرشاد شادؔ نے ظہیر کی سرپرستی فرمائی تھی ۔ظہیر چودہ برس کی عمر ہی میں شیخ ابراہیم ذوق کے شاگرد ہو گئے تھے۔ظہیر کی نرینہ اولاد نہیں تھی لیکن بعض ضرب المثل کی طرح مشہور ہو جانے والی ان کی معنوی اولاد انھیں زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔جیسے

چاہت کا جب مزہ ہے کہ وہ بھی ہوں بے قرار
دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی

کچھ تو ہوتے ہی ہیں الفت میں جنوں کے آثار
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

ڈاکٹر مختار شمیم (بھوپال) نے ان پر مونو گراف ترتیب دیا ہے جسے NCPUL دہلی نے شائع کیا ہے۔

علامہ اقبال نے ظہیر دہلوی کی تاریخ وفات اس طرح نکالی ہے:

زبدہ عالم ظہیر دہلوی (1329ھ)

علامہ اقبال کو امیر مینائی سے دلی لگاؤ تھا۔امیر مینائی کی پیدائش لکھنو میں ۲۱ر فروری ۱۸۲۹ء کو ہوئی اور وفات تیرہ چودہ اکتوبر کی درمیانی شب سن ۱۹۰۰ء میں حیدر آباد میں ہوئی ۔ان کی شہرت ''امیر اللغات'' سے زیادہ ہوئی ۔امیرؔ نے واجد علی شاہ کی شان میں قصیدے بھی لکھے ''غیرتِ بہارستان''۔وہ طِب،علم جفر وغیرہ میں بھی دخل رکھتے تھے ان کی

کتاب ''رموزِ غیبیہ'' گواہ ہے ۔اس کے علاوہ مینائے سخن ،مراۃ الغیب ،صنم خانہء عشق ،دیوانِ امیر، مثنوی عاشقانہ ،رباعیات ،مسدسات، محامد خاتم النبیین ان کے شعری کارنامے ہیں ۔امیؔر نے نثر میں بھی امیر اللغات کے علاوہ کچھ اور یادگاریں بھی چھوڑی ہیں جیسے تذکرہ شعرائے رام پور (انتخابِ یادگار)، خیابان آفرینش ،زادالامیر ،سرمہء بصیرت وغیرہ ۔امیر نے ''نماز کے اسرار'' نامی کتاب بھی لکھی ۔اقبال کو ان سے اتنی زیادہ عقیدت تھی کہ فرماتے ہیں:

عجیب شئے ہے صنم خانہء امیؔر اقبال
میں بت پرست ہوں رکھ دی کہیں جبیں میں نے

امیؔر مینائی پر اقبال ایک مبسوط مقالہ انگریزی میں لکھنا چاہتے تھے تا کہ مغربی دنیا کو امیر سے متعارف کرواسکیں ۔ان کا یہ خواب پورا نہ ہوسکا ۔اقبال نے امیر مینائی کی تاریخ وفات قرآن مجید کی سورۃ الشعراء کی آیت ۸۴ سے نکالی ۔وجعل لی لسان صدق فی الآخرین یہ دراصل ابراہیم علیہ السلام کی دعا ہے کہ مالک میرا ذکرِ خیر آنے والی نسلوں کی زبانوں پر جاری رکھ۔"لسان صدق فی الآخرین " کے ٹکڑے سے تاریخ وفاتِ امیر ۱۳۱۸ھ برآمد ہوتی ہے ۔امیر مینائی تہتر ۷۲ برس کی عمر میں دارِفانی سے کوچ کر گئے ۔

علامہ اقبال کو مولانا خواجہ الطاف حسین حالی سے بے حد عقیدت تھی ۔سبھی جانتے ہیں کہ انجمن حمایت الاسلام کے ایک جلسے میں حالی کا کلام اقبال نے خوش گوار ترنم سے سنایا بھی تھا۔اقبال کا شکوہ و جواب شکوہ شاید وجود میں نہ آتے اگر حالی کی مسدس مدو جزرِ اسلام نہ ہوتی ۔

شبلی کی عالمانہ حیثیت کا اقبال کو خوب اندازہ تھا اور پھر عطیہ فیضی کے حوالے سے بھی دونوں کا ذکر ہوتا ہے۔

حالی اور شبلی میں بیس سال کا فرق تھا۔ حالی ۱۸۳۷ء میں اور شبلی ۱۸۵۷ء میں عالمِ وجود میں آئے۔ اقبال بھی شبلی سے بیس سال چھوٹے تھے کہ وہ ۱۸۷۷ء میں پیدا ہوئے تھے۔ حالی و شبلی کی وفات صرف چند ہی دن کے فرق سے ۱۹۱۴ء میں ہوئی۔ گویا عرصہء حیات میں بیس سال کا فرق برقرار رہا۔ حالی و شبلی کو ایک ہی نظم میں اقبال نے خراج عقیدت پیش کیا۔

شبلی کو رو رہے تھے ابھی اہلِ گلستاں
حالی بھی ہو گیا سوے فردوس رہ نورد

اقبال نے شبلی کی لوح مزار کے لیے نثر میں تاریخ وفات نکالی جس سے ۱۳۳۲ھ برآمد ہوتا ہے۔ وہ نثری ٹکڑا ہے ''امام الہند والانژاد شبلی طاب ثراہ''

علامہ اقبال کے ایک قریبی دوست میاں شاہ دین ہمایوں تھے جن کی پیدائش ۲/اپریل ۱۸۶۸ء یعنی غالب کی وفات سے دس ماہ پہلے اور وفات ۲/جولائی ۱۹۱۸ء کو ہوئی تھی۔ ان کی وفات پر اقبال نے فارسی میں ایک دل چسپ قطعہ کہا۔ میاں شاہ دین ہمایوں ''علامہ فصیح'' کہلاتے تھے۔ اقبال نے جو دل چسپ تاریخ وفات نکالی وہ ان کی لوح مزار پر کندہ ہے۔

درگلستانِ دہر ہمایونِ نکتہ سنج
آمد مثالِ شبنم و چوں بوئے گا رمید
می جست عندلیب خوش آہنگ سال فوت
''علامہ فصیح'' زِ ہر چارسو شنید

''علامہ فصیح'' کے اعداد بنتے ہیں (۳۳۴) تین سو چونتیں کو اگر چار سے ضرب دیں تو ان کی تاریخ وفات ۱۳۳۶ھ نکل آتی ہے۔

پیزادہ محمد حسین عارفؔ ایک صوفی منش شاعر تھے۔ یہ ۳۰ر ستمبر ۱۸۵۶ء کو پیدا ہوئے اور ۳۰ر مارچ ۱۹۲۸ء کو بہتر برس کی عمر میں وفات پائی۔ عارف صاحب نے 1900 اور 1901 میں مولانا رومؔی کی مثنوی میں سے ایک سو حکایات کا سلیس اردو ترجمہ کر ڈالا جو ''عقد گوہر یا موتیوں کا ہار'' کے نام سے شائع ہوا تیرہ سو چھبیس اشعار پر مشتمل مذکورہ منظوم اردو ترجمے کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں موصوف کی اس کتاب کی اشاعت کے موقع پر اقبال نے اس کی تاریخ خوب نکالی ہے۔ یہ تاریخی قطعات چار اردو میں ہیں تو دو فارسی میں بھی ہیں۔ رومی تو اقبال کا ہیرو ہے ہی۔ اسی حوالے سے پیرزادہ محمد حسین عارف سے بھی انھیں محبت تھی پیر بھائی جو ٹھیرے۔ ان کی تاریخیں ملاحظہ فرمایئے۔

مرحبا اے ترجمانِ مثنویِ معنوی
ہست ہر شعرِ تو منظورِ نگاہِ انتخاب
از پئے نظارہء گل دستہء اشعارِ تو
حسنِ گویائی زِ روئے خویش بردارد نقاب
بہرِ سالِ طبعِ قرآنِ زبانِ پہلوی
بلبلِ دل می سراید ''تلک آیات الکتاب''

''تلک آیات الکتاب'' کے ٹکڑے سے عارف صاحب کی کتاب کی تاریخ ۱۳۱۷ھ برآمد ہوتی ہے۔

پیرزادہ محمد حسین عارف کی ایک اور کتاب کا مادۂ تاریخ بھی دل چسپ ہے۔ اقبال کتاب کی تعریف کرتے ہوئے تین شعر کے آخری مصرعے کے ایک ٹکڑے سے تاریخ اشاعت نکالتے ہیں۔

میرے مخدوم ومکرم نے لکھی ایسی کتاب
شاہدِ لیلائے عرفاں کا جسے محمل کہیں
ہے مصنف نخل بندِ گلشنِ معنی اگر
مزرعِ کشتِ تمنا کا اسے حاصل کہیں
از پئے تاریخ ہاتف نے کہا اقبال سے
زیب دیتا ہے اگر ''مرغوبِ اہلِ دل'' کہیں

''مرغوبِ اہل دل'' کے ٹکڑے سے تاریخ اشاعت ۱۳۱۸ھ برآمد ہوتی ہے۔

پیرزادہ عارف کی کتاب کی تاریخ عیسوی سن میں بھی برآمد کی ہے:

غیرتِ نظم ثریا ہے یہ نظم دل کش
خوبیٔ قول اسی نظم کی شیدائی ہے
فکرِ تاریخ میں۔ میں سرِ بگریباں جو ہوا
کہہ دیا دل نے ''یہ خضرِ رہِ دانائی ہے''

آخری مصرع کے آخری حصے (یہ خضرِ رہِ دانائی ہے) سے ۱۹۰۱ء برآمد ہوتا ہے ان کی کتابیں (۱۹۰۰) اور (۱۹۰۱) میں شائع ہوئی ہیں جس کا سال ہجری (۱۳۱۷ھ) اور (۱۳۱۸ھ) ہوتا ہے۔

ایک اور قطعہ تاریخ جس میں اقبال نے تدخلہ وتخرجہ کی سہولت سے استفادہ کیا ہے

بزمِ سخن میں اہلِ بصیرت کا شور ہے
یہ نظم ہے کہ چشمِ فصاحت کا نور ہے
میں نے کہا یہ دل سے کہ اے مایۂ ہنر
تاریخِ سالِ طبع کا لکھنا ضرور ہے

ہاتف نے دی صدا سرِ اعدا کو کاٹ کر
حقایہ نظم موجِ شرابِ طہور ہے

اس قطعے کے آخری مصرعے سے ۱۹۰۱ء برآمد ہوتا ہے مگر ''سرِ اعدا'' کو کاٹ کر یعنی اعدا کے پہلے حرف الف کے عدد (ایک) کو منہا کردیں تو ۱۹۰۰ء حاصل ہوتا ہے جو کتاب کی تاریخ اشاعت ہے۔

رومی کی مثنوی کی اہم اہم حکایات کا موثر ترجمہ کیا گیا تھا اس لیے پیرزادہ عارف کی داد دیتے ہوئے ان کے ترجمے کی کتاب کا مادۂ تاریخ یوں نکالا ہے۔

روح فردوس میں رومی کی دعا دیتی ہے
آپ نے خوب کیا اور اسے خوب لکھا
درد مندانِ محبت نے اسے پڑھ کے کہا
نقشِ تسخیر پئے طالب و مطلوب لکھا
ہاتفِ غیب کی امداد سے میں نے اقبال
بہرِ تاریخ اشاعت ''سخنِ خوب'' لکھا

مرکب لفظ (سخنِ خوب) سے تاریخ اشاعت ۱۳۱۸ھ برآمد ہوتی ہے۔

پیسہ اخبار کے مدیر محبوب عالم سے اقبال کو بڑی محبت تھی وہ اقبال کے بزرگ دوستوں میں تھے۔ 1863ء میں پیدا ہونے والے محبوب عالم کا انتقال ستر برس کی عمر میں ۲۳ رمئی ۱۹۳۳ء کو لاہور میں ہوا۔ اقبال بھاری دل سے ان کے جنازے میں شریک رہے اور ان کے انتقال پر ایک قطعے سے مادۂ تاریخ نکالا۔ یہ قطعہ محبوب عالم کے مزار کے کتبے پر درج ہے۔

سحر گاہاں بگورستاں رسیدم
دراں گورے پُر از انوار دیدم
زہاتف سالِ تاریخش شنیدم
معلیٰ تربتِ محبوبِ عالم

آخری مصرعے سے تاریخِ وفات ۱۳۵۱ھ برآمد ہوتی ہے۔

علامہ اقبال کو سرسید احمد خاں سے بھی بڑی عقیدت تھی۔ان کی وفات پر کسی نے ''غفرلہ'' سے تاریخ نکالی تھی مگر اقبال نے قرآنِ مجید کی سورۃ آل عمران کی آیت: ۵۵ "اِنّیِ مُتَوفّیكَ وَ رَافِعُكَ اِلّی و مطھرُك "سے ان کی تاریخ وفات (۱۳۱۵ھ مطابق 1898) نکالی۔اس کے علاوہ کانّہُ مسیح "لِکُلِ مراض (1315ھ) سے بھی اقبال نے سرسید کی تاریخِ وفات نکالی۔

(''ہمایوں'' اپریل 1953 بحوالہ کلیاتِ باقیاتِ شعرِ اقبال مرتبہ ڈاکٹر صابر کلوروی۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی۔سن اشاعت 2005)

حیدرآباد کے مہاراجہ کشن پرشاد شاؔد سے اقبال کے قریبی تعلقات تھے دونوں کے مابین خط کتابت بھی رہی ہے۔ان کے ہاں جب ایک لڑکا پیدا ہوا تو اس کے لیے اقبال نے تاریخی نام پیش کیا ''عالم پناہ مہاراجہ عالمگیر پرشاد'' جس سے 1332ھ نکلتی ہے۔

نواب وقار الملک کی وفات پر اقبال نے ان کے خطاب کے ذریعے ان کی تاریخِ وفات نکالی۔

نواب وقارالملک و ملت افشاند سوئے جناں رکابش
بر لوحِ مزارِ او نوشتم انجام بخیر۔ با خطابش

خطاب ''وقار الملک کے ساتھ انجام بخیر شامل کریں تو 1335ھ تاریخ وفات نکلتی ہے۔

اقبال اپنے استاد ای جی براؤن کی تاریخِ وفات بھی قرآنی آیات کے ایک ٹکڑے ذالك الفوز العظيم سے 1926 نکالتے ہیں۔

نازشِ اہلِ کمال ،ای جی برون   فیضِ او در مغرب و مشرق عمیم
مغرب اندر ماتمِ او سینہ چاک   از فراقِ او دلِ مشرق دو نیم
تا بہ فردوسِ بریں، ماوی گرفت   گفت ہاتف ''ذالك الفوز العظيم

اقبال اپنے والدِ ماجد شیخ نور محمد عرف شیخ نتھو کے انتقال پُر ملال پر ایک قطعے کے آخری مصرعے میں دو دو الفاظ ''اثرِ رحمت'' اور ''آغوشِ لحد'' سے تاریخِ وفات 1349ھ مطابق 1930 نکالتے ہیں۔

پدر و مرشدِ اقبال ازیں عالم رفت
ماھمہ راہرواں ،منزلِ ما ملکِ ابد
ہاتف از حضرتِ حق خواست دو تاریخ رحیل
آمد آواز ''اثر رحمت'' و ''آغوشِ لحد''

سر سید کے پوتے سر راس مسعود تو علامہ اقبال کے قریب ترین دوستوں میں رہے۔ ۱۸۸۹ء میں پیدا ہوئے تھے گویا وہ اقبال سے عمر میں بارہ برس چھوٹے تھے لیکن اقبال سے آٹھ ماہ پہلے ہی ۱۵/ اگست ۱۹۳۷ء کو اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ اقبال نے ان کے مرنے پر کوئی تاریخ تو نہیں نکالی کہ خود اقبال آخری عمر میں صاحب فراش تھے البتہ سر راس مسعود کے ہاں جب ایک لڑکی تولد ہوئی تو اقبال نے اس کی برجستہ تاریخ نکالی تھی۔

راسِ مسعودِ جلیل القدر کو جو کہ اصل و نسل میں مجدود ہے
یاد گارِ سید والا گہر نور چشمِ سیدِ محمود ہے
راحتِ جان و جگر دختر ملی شکرِ خالق ،منتِ معبود ہے
خانداں میں ایک لڑکی کا وجود باعثِ برکاتِ لا محدود ہے
کس قدر برجستہ ہے تاریخ بھی
باسعادت دخترِ مسعود ہے

آخری مصرعے سے ۱۹۳۷ء برآمد ہوتا ہے۔

منشی محمد الدین فوق مدیر اخبار کشمیری سے اقبال کے قریبی دوستانہ تعلقات تھے وہ ۱۸۷۶ء میں پیدا ہوئے تھے اور ۱۴/اگست ۱۹۴۵ء کو یعنی اقبال کے مرنے کے سات سال بعد انتقال کر گئے۔ ستمبر ۱۹۰۹ء میں فوق کا پہلا مجموعہ شائع ہوا تھا ''کلامِ فوق''۔ ان کے کلام کی خوبیوں کے اقبال معترف تھے۔ اور ان کے مجموعۂ کلام کی اشاعت پر تاریخ بھی نکالی۔

جب چھپ گیا مطبع میں یہ مجموعۂ اشعار معلوم ہوا مجھ کو بھی حالِ نضرِ فوق
شستہ ہے زباں، جملہ مضامین ہیں عالی تعریف کے قابل ہے خیالِ نضرِ فوق
تاریخ کی مجھ کو جو تمنا ہوئی اقبال ہاتف نے کہا لکھ دے ''کمالِ نضرِ فوق''

''کمالِ نضرِ فوق'' سے ۱۳۲۷ھ برآمد ہوتا ہے جو تاریخ اشاعتِ کلامِ فوق ہے۔ نضر (ض) سے ہے یہ مادۂ ہائے تاریخ اقبال کی فکرِ رسالے کے دل کش نمونے ہیں۔

زندہ رود'' (ڈاکٹر جاوید اقبال) اور ''دانائے راز'' (نذیر نیازی) کے مطابق علامہ اقبال کی پہلی بیوی کریم بی بی ایک امیر گھرانے کی فرد تھیں اور گجرات کے محلّہ شال بافاں کی ایک ایسی حویلی میں پرورش پائیں جو کسی محل سے کم نہ تھی۔ ان کے والد ڈاکٹر عطا محمد کنگ ایڈورڈ میڈیکل

کالج کے اولین سند یافتہ طلبہ میں سے تھے۔ جدّہ میں حکومت برطانیہ کی طرف سے وائس قونصل رہ چکے تھے۔ پھر پنجاب کے مختلف اضلاع میں سوِل سرجن بھی تعینات رہے جہاں کہیں بھی رہے بڑی شان وشوکت سے رہے مگر دولت کی فراوانی کے باوجود بڑے دین دار، عبادت گزار اور نیک انسان تھے۔ عوام میں بہت مقبول تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ٹوپیوں کا کاروبار کرنے والے غریب شیخ نور محمد عرف شیخ نتھو جیسے صوفی منش کے بیٹے محمد اقبال سے اپنی نازوں پلی بیٹی کریم بی بی کا نکاح کر دیا۔ اس وقت اقبال صرف سولہ سال کے اور کریم بی بی انیس 19 سال کی تھیں۔ اقبال اور کریم بی بی کے مزاجوں کے فرق کی وجہ سے دونوں میں نباہ نہ ہوسکا اقبال سے کریم بی بی نے طلاق تو نہ لی مگر علاحدگی اختیار کرلی ہر چند کہ اقبال سے ان کے ہاں معراج بیگم اور آفتاب اقبال پیدا ہوئے جو انہی کے ساتھ اپنی دولت مند ننھال میں پلے بڑھے۔ پہلی بیوی سے قطع تعلق کی وجہ سے اقبال دوسری شادی کرنا چاہتے تھے چنانچہ 1910ء میں سردار بیگم سے ان کا نکاح ہوا۔ سردار بیگم اور ان کے بھائی خواجہ عبدالغنی دونوں بچپن ہی میں یتیم ہوگئے تھے۔ اور لاہور کے موچی دروازے کے ایک غریب کشمیری خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان یتیموں کی پرورش ان کی پھوپی نے کی۔ پھوپا ضلع کچہری میں معمولی عرضی نویس تھے۔ سردار بیگم کسی اسکول نہ جاتی تھیں انھوں نے گھر پر ہی قرآن مجید اور معمولی اردو کی تعلیم حاصل کی تھی۔ خواجہ عبدالغنی قالین بیچ کر پیٹ پالتے تھے۔ نکاح کے وقت سردار بیگم بھی انیس 19 برس کی تھیں جب کہ اقبال ان سے تقریباً دگنی عمر کے تھے۔ (خالد نظیر صوفی کی تحقیق کے مطابق علامہ اقبال کی تاریخ پیدائش 29 دسمبر 1873 ہے۔) ابھی رخصتی ہونے بھی نہ پائی تھی کہ سردار بیگم کے خلاف کچھ گم نام خطوط اقبال کو ملے اور اقبال بدظن ہوکر رخصتی کا معاملہ ٹالتے رہے حتیٰ کہ طلاق دینے کا ارادہ تک کرلیا تھا۔

اسی اثنا لدھیانہ کے ایک متمول کشمیری گھرانے کے ''نولکھا'' خاندان کی صاحب زادی مختار بیگم سے 1913ء میں اقبال کی تیسری شادی ہوئی۔غلط فہمیوں کے ازالے کے بعد مختار بیگم کی مرضی سے اقبال اپنی دوسری بیوی سردار بیگم کو بھی تجدید نکاح کے بعد گھر لے آئے۔اس طرح یہ دونوں بیویاں ایک ہی گھر میں اقبال کے ساتھ (انار کلی لاہور) میں مل جل کر رہنے لگیں۔پہلی بیوی بھی چند دن اس گھر میں رہ کر اپنے میکے لوٹ گئیں۔

شادی کے دس گیارہ برس تک دونوں بیویوں کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی۔پھر اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ دونوں ایک ساتھ حاملہ ہوئیں چنانچہ 5۔اکتوبر 1924ء کو سردار بیگم کے ہاں جاوید اقبال پیدا ہوئے اور مختار بیگم ڈیلیوری (زچگی) کے دوران اپنے میکے لدھیانہ میں 12۔اکتوبر 1924ء (مطابق 1343ھ) کو انتقال کر گئیں وہیں تدفین بھی عمل میں آئی۔علامہ اقبال کسی قادری سلسلے کے امام کے ذریعے مختار بیگم کی نمازِ جنازہ پڑھوانا چاہتے تھے مگر عدم دستیابی کی صورت میں خود ہی نماز جنازہ پڑھائی۔اقبال نے اپنے دوست مولانا غلام قادر گرامی سے گزارش کی تھی کہ مختار بیگم کے لیے قطعہء تاریخ وفات کہہ دیں مگر خود اقبال نے لدھیانہ ہی میں تین شعر کا ایک قطعہ تاریخ وفات لکھا جو مختار بیگم کی لوح مزار پر کندہ ہے جس کے آخری مصرعے سے ہجری سن 1343 برآمد ہوتا ہے۔

اے دریغا زمرگِ ہم سفرے دلِ من درفراقِ او ہمہ درد
ہاتف ازغیب داد تسکینم سخنِ پاکِ مصطفے آورد
بہرِ سالِ رحیلِ او فرمود بشہادت رسید و منزل کرد

مختار بیگم کے انتقال کے گیارہ برس بعد والدۂ جاوید سردار بیگم کا لاہور میں 23 مئی 1935ء مطابق 1354ھ انتقال ہوا۔قبرستان بی بیان پاک دامناں ایمپرس روڈ لاہور کے

بلند ٹیلے پر ان کی پختہ قبر موجود ہے اور علامہ اقبال کا لکھا ہوا قطعہ تاریخ وفات لوح مزار کی زینت ہے جس کے آخری مصرعے کے آخری دولفظوں سے سردار بیگم کی تاریخ وفات اقبال نے نکالی ہے:

راہی سوئے فردوس ہوئی مادرِ جاوید
لالے کا خیاباں ہے مرا سینۂ پُرداغ
ہے موت سے مومن کی نگہ روشن و بیدار
اقبال نے تاریخ کہی ''سرمۂ مازاغ''

''سرمۂ مازاغ'' سے 1354ھ تاریخ وفات برآمد ہوتی ہے۔قرآن کے سورۂ نجم کی آیت 17 ''مازاغ البصر و ماطغیٰ'' سے استفادہ کیا گیا ہے۔معراج کے موقع پر کہا گیا کہ رسول اللہ کی نظر نہ اچٹی نہ انھوں نے نگاہ پھیری (احسن البیان)۔

اقبال کی پہلی بیوی کریم بی بی (والدۂ آفتاب اقبال) علامہ اقبال کے انتقال کے بعد بھی تقریباً 9 نو برس حیات رہیں اور 28 فروری 1947ء کو تقریباً 74 چوہتر برس کی عمر میں دارِ فانی سے کوچ کر گئیں۔ان کی تدفین معراج دین قبرستان لاہور میں ہوئی۔اگر اقبال کی زندگی میں ان کا انتقال ہوا ہوتا تو ممکن تھا کہ بہ تقاضائے انصاف علامہ اقبال ان کے لیے بھی قطعہ تاریخ وفات کہہ دیتے۔

ماخذ

۱۔ ''مولوی نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی'' مرزا فرحت اللہ بیگ مطبوعہ ایجوکیشنل بک ہاؤس۔علی گڑھ۔۱۹۹۱ء

۲۔ ''اسرار ورموز'' سید احمد ایثار۔ایثار پبلشنگ ہاؤز ٹرسٹ بنگلور سال اشاعت ۲۰۰۸ء

۳۔ ''اپنا گریباں چاک'' خود نوشت سوانح ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال سنگ میل پبلیکیشنز لاہور۔۲۰۰۶ء (اضافہ شدہ ایڈیشن)

۴۔ ''معاصرین، اقبال کی نظر میں'' محمد عبداللہ قریشی۔مجلس ترقی ادب لاہور نومبر ۱۹۷۷ء

۵۔ اقبال درون خانہ۔خالد نظیر صوفی۔اقبال اکادمی پاکستان 2003

۶۔ احسن البیان۔تفسیر وترجمہ قرآن مجید۔مطبوعہ۔شاہ فہد قرآن شریف پرنٹنگ کمپلکس، مدینہ منورہ 1417ھ۔

۷۔ دریافت (تحقیقی وتنقیدی مضامین) ڈاکٹر محمد یحییٰ جمیل۔برار مسلم لٹریری فورم۔امراوتی، نومبر 2014۔

۸۔ کلیاتِ باقیاتِ شعرِ اقبال مرتبہ ڈاکٹر صابر کلوروی۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی۔سن اشاعت 2005)

☆☆☆

اقبال کے فکر وفن کا گراف

میں نے اس سے پہلے بھی اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ ادب، آرٹ، شعر یا اسلوب کی جامع تعریف کرنا حروفِ مقطعات کے معنی تلاش کرنے کے برابر ہے۔

فی الحال ہمارا سروکار اسلوب سے ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اسلوب ہی شخصیت ہوتا ہے۔Style is the Person۔ مگر شخصیت تو شکست و ریخت کے عمل سے گزرتی رہتی ہے۔ شخصیت کے ذہنی ارتقا کے ساتھ ساتھ اس کا انداز بھی بدلتا رہتا ہے۔ رہن سہن اور لکھنے پڑھنے میں بھی نمایاں تبدیلی آتی رہتی ہے۔

اسلوب کی تشکیل و تعمیر میں تخیل، انتخابِ موضوع، لفظیات اور رویّہ Treatment اپنا اپنا حصہ ادا کرتے ہیں۔ اسلوب یعنی Diction ہی فن کار کی پہچان ہے۔

اردو کے ہر قابلِ ذکر شاعر کے بارے میں کہا جاتا رہا ہے کہ نو دس برس کی عمر ہی سے کلام موزوں اس کی زبان سے نکلنے لگا تھا۔ سر عبدالقادر کے بیان کے مطابق اقبال کا بھی یہی حال تھا۔ ظاہر ہے نو دس برس کی عمر میں جیسے کچھ شعر کہے جاتے رہے ہوں گے وہ نوجوانی میں کچھ اور ہو جائیں گے اور پھر تجربہ و مشاہدہ کے ساتھ ساتھ فکر و فن میں پختگی آنا لازمی ہے۔ یہ رازِ غیر سر بستہ (Open Secret) ہے۔ اقبال بھی ایسی ہی منزلوں سے گزر کر علامہ اقبال بنے۔

ابتدا میں اقبال اکبر الہ آبادی سے بہت متاثر رہے۔ ان کے فکر و فن کے اس قدر گرویدہ تھے کہ ان کی پیروی تک کرنے لگے۔ اقبال کے ظریفانہ کلام کا یہ حال ہے کہ انھیں

اکبری اقبال کہا جانے لگا۔

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی　　ڈھونڈ لی قوم نے فلاح کی راہ
روشِ مغربی ہے مدِّ نظر　　وضع مشرق کو جانتے ہیں گناہ
یہ ڈرامہ دکھائے گا کیا سین
پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ
اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں　　نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے

اقبال کے یہ دو شعر ملاحظہ فرمایئے اور نو جوانوں کی صورتِ حال ذہن میں لائے۔

شیخ صاحب بھی تو پردے کے کوئی حامی نہیں
مفت میں کالج کے لڑکے اُن سے بدظن ہو گئے
وعظ میں فرما دیا یہ آپ نے کل صاف صاف
پردہ آخر کس سے ہو جب مرد ہی زن ہو گئے

اس موقع پر اکبرالہ آبادی کا وہ مشہور قطعہ بھی یاد کیجیے:

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو اُن سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

اقبال کوئی اکبرالہ آبادی ثانی بننے کے لیے پیدا نہیں ہوئے تھے۔ اس بات کا احساس خود اکبر نے اقبال کو کرایا اور انھیں اپنا رنگ آپ، اپنی ڈگر آپ نکالنے کا مشورہ دیا اور کہا ''چلتا نہیں کام نقالی سے''

پھر یوں ہوا کہ اقبال نے ''ہمالہ'' کو اپنی فکر کا سنگِ بنیاد بنایا۔ جس فکر و فن کی بنیاد ہی ہمالہ پر رکھی گئی ہو اس کے متزلزل ہونے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ یہ نظم ''مخزن'' اپریل 1901ء میں شائع ہوئی جب اقبال کی عمر چوبیس سال تھی۔

اے ہمالہ اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں
چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں
تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں
تو جواں ہے گردشِ شام و سحر کے درمیاں
ایک جلوہ تھا کلیم طورِ سینا کے لیے
تو تجلی ہے سراپا چشمِ بینا کے لیے

آٹھ بندوں پر مشتمل مسدس کی ہئیت میں کہی ہوئی اس نظم کی تان اس شعر پر ٹوٹتی ہے

ہاں دکھا دے اے تصور پھر وہ صبح و شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

وہ مسدس جو انیس و دبیر کی خاندانی جاگیر ہو کر غم ناکی کی علامت ہوگئی تھی اب اقبال پسندی نے اُسے سرخ رو کیا۔ ''ہمالہ'' سے لے کر شکوہ۔ جوابِ شکوہ تک اسی ہئیت میں اقبال نے اپنے اسلوب کے ارتقا کا کمال دکھایا۔ اقبال کی بعض ابتدائی شاہ کار نظمیں مسدس ہی کی ہئیت میں ہیں۔ ہمالہ کے بعد گل رنگیں، عہد طفلی، مرزا غالب ابر کو ہسار، آفتابِ صبح، نالہ فراق (آرنلڈ کی یاد میں)۔ شکوہ، جواب شکوہ تک اقبال نے اس ہئیت کو نئے نئے موضوعات سے ہم کنار کر کے اس کو نئی زندگی بخشی اقبال کے اسلوب کا ارتقا دراصل اقبال کا ذہنی ارتقا بھی ہے۔ اب مسدس محض کربلائی واقعات کی رنگ آمیزی کا نمونہ نہیں رہ گئی تھی

بلکہ اسے خواجہ الطاف حسین حالؔی نے "مدو جزرِ اسلام" کے اظہار کے لیے چن کر نیا وقار بخشا پھر علامہ اقبال نے شکوہ جوابِ شکوہ کے ذریعے اسے نئی بلندیوں تک پہنچایا۔

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں طاقت پرواز مگر رکھتی ہے
قدسی الاصل ہے رفعت پہ نظر رکھتی ہے
خاک سے اٹھتی ہے گردوں پہ گزر رکھتی ہے
عشق تھا فتنہ گر و سرکش و چالاک مرا آسماں چیر گیا نالہء بے باک مرا

منفعت ایک ہے اس قوم کی، نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی دین بھی ایمان بھی ایک
حرمِ پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک
فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

اقبال نے مرثیے بھی لکھے جیسے ان کا پہلا مرثیہ مرزا غالب کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے کہا گیا:

فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا
تھا سراپا روح تو، بزمِ سخن۔ پیکر ترا زیبِ محفل بھی رہا محفل سے پنہاں بھی رہا
دید تیری آنکھ کو اس حُسن کی منظور ہے
بن کے سوزِ زندگی ہر شئے میں جو مستور ہے

اقبال نے اپنی والدہ مرحومہ کا جو مرثیہ لکھا وہ بجائے خود ایک شاہ کار فلسفیانہ نظم ہے

تخمِ گل کی آنکھ زیر خاک بھی بے خواب ہے
کس قدر نشو ونما کے واسطے بے تاب ہے

اور یہ طویل مرثیہ اس دعائیہ شعر پر اختتام پذیر ہوتا ہے

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

سرسید، حالی، شبلی، آرنلڈ وغیرہ کی مثالیں بھی سامنے ہیں جن کے لیے اقبال نے مرثیے لکھے ہیئت کے حوالے سے بات کی جائے تو مثنوی کو بھی اقبال نے دیو مالائی اثر سے آزاد کرایا۔ من گھڑت قصے ہی مثنوی کی پہچان تھے۔ امانت، شوق، میر، میر حسن، دیا شنکر نسیم وغیرہ کی مثنویاں گواہ ہیں۔ میر صاحب نے اژدر نامہ لکھ کر خود کو اژدہا اور دیگر شعراء کو حشرات الارض تک قرار دیا تھا۔ مگر اقبال نے ''ساقی نامہ'' لکھ کر مثنوی میں فکر و فلسفہ کی ایک دنیا رکھ دی۔

حقیقت خرافات میں کھو گئی   یہ امت روایات میں کھو گئی
بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے   مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے
جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے   مرا عشق میری نظر بخش ہے
یہ موجِ نفس کیا ہے تلوار ہے   خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے
خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات   خودی کیا ہے بیداریِ کائنات
خودی جلوہِ بدمست و خلوت پسند   سمندر ہے اک بوند پانی میں بند

خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے
فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے

اس طرح اقبال نے مثنوی جیسی از کار رفتہ ہئیت کو ایک زندہ فلسفہ سے آشنا کیا۔ فارسی میں جو کچھ شاہ کار چھوڑے وہ الگ ہیں۔ فی الحال ہم اردو کی اصناف تک خود کو محدود رکھتے ہیں۔

علامہ اقبال نے طویل نظمیں لکھیں جن کا ایک ایک شعر ان کی اعلی فکر کا غماز ہے جیسے ذوق وشوق۔ مسجد قرطبہ۔

صدق خلیل بھی ہے عشق ،صبر حسین بھی ہے عشق
معرکہء وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

لوح بھی تو قلم بھی تو ،تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ ، تیرے محیط میں حباب

اس نظم میں انسان، کائنات، عشق، زندگی سب پر اظہارات ہیں۔ اسی طرح مسجد قرطبہ میں وقت کے فلسفے کو پیش کیا گیا ہے جو اپنی جگہ مکمل موضوع ہے۔

سلسلہء روز و شب نقش گر حادثات
سلسلہ روز و شب اصلِ حیات و ممات
آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہنر
کارِ جہاں بے ثبات ،کار جہاں بے ثبات
اول و آخر فنا ،باطن و ظاہر فنا
نقشِ کہن ہو کہ نو منزلِ آخر فنا
نقش ہیں سب نا تمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام ،خونِ جگر کے بغیر

اقبال نے جہاں طویل نظمیں کہی ہیں وہیں دو دو تین تین شعر کی نظمیں بھی کہہ کر اپنی بات رکھ دی ہے۔ جیسے ''خودی کی تربیت''

خودی کی پرورش و تربیت پہ ہے موقوف
کہ مشتِ خاک میں پیدا ہو آتشِ ہمہ سوز
یہی ہے سرِ کلیمی ہر اک زمانے میں
ہوائے دشت و شعیب وشبانیِ شب و روز

دو دو تین تین چار چار اشعار تو دور کی بات ہے اقبال کا ایک ایک شعر بھی ایک ایک نظم کی حیثیت رکھتا ہے۔

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

چار چار مصرعوں میں بھی اقبال نے اپنی فکر انڈیل کر رکھ دی ہے۔ پیامِ مشرق میں ''لالہ ءطور'' یا ارمغان حجاز کے قطعات تو مثال میں پیش کیے جاسکتے ہیں جنھیں اقبال نے رباعیات کا نام دیا ہے مگر ہم اردو کی حد تک اقبال کے اسلوب کے پابند ہیں۔

محبت کا جنوں باقی نہیں ہے — مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے
صفیں کج، دل پریشاں، سجدہ بے ذوق — کہ جذبِ اندروں باقی نہیں ہے
خدائی اہتمام خشک و تر ہے — خدا و ندا خدائی دردِ سر ہے
ولیکن بندگی استغفراللہ — یہ دردِ سر نہیں دردِ جگر ہے

اصناف وہیئت کے اعتبار سے اقبال کے اسلوب کے ارتقا کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی بعض نظموں کے اندرون میں اتریں تو اقبال کا فکری انقلاب بھی دکھائی دیتا ہے۔ جیسے نظم ''نیا شوالہ''

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہوگئے پرانے
پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ ۔ دیوتا ہے

مگر پھر اقبال نے اس فکر سے ہاتھ اٹھا لیے۔

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

اسی طرح ترانہء ہندی

سارے جہاں سے اچھا ہندستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستان ہمارا

اب نیا روپ دھارتا ہے جو علاقائیت سے آفاقیت کی طرف سفر کا استعارہ۔

چین وعرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

ہر چند کہ فی الحال اقبال کے اردو شاہ کاروں کے حوالے سے گفتگو کی جاری ہے پھر بھی گوئٹے کے دیوان مغرب (West Osticher Divan) مطبوعہ 1819 کے تقریباً ایک سو برس بعد علامہ اقبال نے ''پیام مشرق'' پیش کر کے یہ اس کے سرنامے پر لکھ دیا ''وللہ المشرق والمغرب'' کہ مشرق ومغرب کی فرماں روائی کا حق صرف الہ واحد ہی کو ہے۔

دانتے کی طربیہء خداوندی Divine Comedy کے بالمقابل ''جاوید نامہ'' جیسی بڑی لکیر کھینچ کر اپنے تخیل کو حسّی پیکر میں ڈھال کر دکھا دیا۔ اقبال نے اس میں شک نہیں دانتے، گوئٹے کے علاوہ نطشے و برگساں جیسے مغربی فلسفیوں سے استفادہ کیا مگر اپنی مشرقی حیثیت کو متاثر ہونے نہیں دیا۔ اس موقع پر بارگاہِ الٰہی میں اقبال کی یہ جسارت بھی قابلِ داد ہے:

تو شب آفریدی ، چراغ آفریدم سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

برگساں نے کہا تھا کہ انسان کی کاری گری، قدرت کو اک حسنِ اضافی دیتی ہے۔ محراب گل افغان ہو کہ ابوالعلا معری یا رومی، اقبال نے اخذ و اختیار کے ساتھ ساتھ ردوقبول کا اسلوب اپنایا۔ مشرق و مغرب کے کسی بڑے سے بڑے فلسفی و ادیب کی ذات میں وہ گم نہیں ہو جاتے بلکہ اپنی شناخت بہر صورت قائم رکھتے ہیں وہ چاہے بچوں کے لیے نظمیں لکھیں کہ بڑوں کے لیے۔ جس کسی سے کوئی خیال اٹھاتے ہیں اس کا ذکر کرنے میں عار محسوس نہیں کرتے۔ یہی اقبال کی اعلیٰ ظرفی ہے جیسے بھرتری ہری سے اٹھایا ہوا خیال ایک بے مثال شعر میں ڈھل گیا

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

اقبال کی مکالماتی نظمیں جبریل و ابلیس، ابلیس کی مجلس شوریٰ جگنو و پروانہ وغیرہ بھی اقبال کے تخیل، موضوع، لفظیات اور پیرایہء اظہار Treatment اسلوب کے شناس نامے ہیں

جہاں تک زبان و بیان کا معاملہ ہے اقبال کی انفرادیت ایک ایک مصرعے سے بولتی ہے۔ ''مخزن'' میں شائع ہونے والی اقبال کی ابتدائی غزلیں فطری اظہار کا نمونہ ہیں۔

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی

مخزن (جون 1901ء)

لاؤں وہ تنکے کہاں سے آشیانے کے لیے
بجلیاں بے تاب ہوں جن کے جلانے کے لیے

مخزن (نومبر 1901ء)

انوکھی وضع ہے سارے زمانے سے نرالے ہیں
یہ عاشق کون سی بستی کے یارب رہنے والے ہیں

دکن ریویو (1904ء)

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں   مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

مذکورہ چند شعر ''بانگِ درا'' کے حصہ اول سے پیش کیے گئے ہیں۔ حصہء دوم (بانگِ درا) میں اقبال کی فکر کا گراف اونچا اٹھتا محسوس ہوتا ہے اور وہ داغ دہلوی کے اثر سے نکلتے دکھائی دیتے ہیں۔

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدارِ یار ہوگا
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا
دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا

تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

بانگِ درا کے تیسرے حصے میں یہ اسلوب اور پختہ ومنفرد ہوتا گیا

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

تو بچا بچا کہ نہ رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

جو میں سر بہ سجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

بال جبریل کی ابتدائی سولہ غزلیں منفرد بھی ہیں اور مسلسل بھی۔ اس میں جو فکر ہے وہ انفرادیت لیے ہوئے بھی ہے اور ایک اندرونی تسلسل خیال کی حامل بھی ان سولہ غزلوں کا جائزہ بجائے خود ایک مضمون کا متقاضی ہے۔ پہلی غزل کا پہلا شعر ہے

میری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں
غلغلہ ہائے الاماں بت کدۂ صفات میں

اور سولھویں غزل کا ایک شعر ہے:

درویش خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلی ، نہ صفاہاں نہ سمر قند

پھر ایک سے اکسٹھ (یعنی سولہ کا الٹا) غزلیں ایسی ہیں جن میں اقبال مختلف قوافی میں اپنے آپ کو بارِ گاہ الٰہی میں پہنچا کر کبھی خود کلامی ،کبھی مخاطبت تو کبھی ڈرامائی کیفیت سے گزارتے ہیں۔

نہ کر تقلید اے جبریل میرے جذب و مستی کی
تن آسا عرشیوں کو ذکر و تسبیح و طواف اولیٰ

ان اکسٹھ غزلوں میں اقبال نے جہاں انسانوں کی رہبانیت گوشہ نشینی اور زمینی زندگی سے عدم دلچسپی کو نشانہ بنایا ہے وہیں محض زمین ہی سے جڑی رہنے والی بے آسماں ارضیت پر بھی چوٹ کی ہے:

سمجھ رہے ہیں وہ یورپ کو ہم جوار اپنا
ستارے جن کے نشیمن سے ہیں زیادہ قریب

''بالِ جبریل'' کی ہر طویل نظم ایک ایک مضمون کی متقاضی ہے جیسے دعا، مسجدِ قرطبہ، ذوق و شوق، ساقی نامہ اور مکالماتی نظمیں جبریل و ابلیس، پیرِ رومی مریدِ ہندی وغیرہ۔

فلسفہ و شعر کی اور حقیقت ہے کیا　　حرفِ تمنا جسے کہہ نہ سکیں روبرو

(دعا)

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر　　نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

(مسجدِ قرطبہ)

صدق خلیل بھی ہے عشق، صبرِ حُسین بھی ہے عشق
معرکہء وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

(ذوق و شوق)

پھر ضرب کلیم کی تخلیقات عام روش سے ہٹی ہوئی ملتی ہیں ۔جس کے لیے ہمارا مضمون ''ضربِ کلیم کا مردِ مسلماں'' ملاحظہ فرمایئے۔

اقبال کی غزل کا ہر شعر بجائے خود اک نظم ہے۔ایک ایک شعر کی شرح کرنے والوں نے اپنے اپنے طور پر اس میں الگ جہانِ معنی تلاش کیے ہیں۔صرف ان کی غزلوں کے حوالے سے اقبال کے اسلوب کا ارتقا پیش کیا جا سکتا ہے۔ان کے فکر و فن کا گراف اوپر سے کبھی نیچے نہیں آتا۔

جہاں تک تصوف کا معاملہ ہے اقبال جزر و مد کا شکار ہیں۔کبھی یہ تصوف کے خلاف باضابطہ نوٹس Notes جمع کرتے دکھائی دیتے ہیں جنھیں کراچی کے پروفیسر صابر کلوروی نے ''تاریخ تصوف'' کے نام سے 1985ء میں شائع کر دیا ہے۔

یورپ کے لیے رختِ سفر باندھنے والا اقبال نظام الدین اولیا کے مزار پر ''التجاے مسافر'' کے ساتھ حاضری بھی دیتا ہے۔شیخ احمد سرہندی کے مزار پر اولادِ نرینہ کے لیے دعا کرتا ہے اور دس سال بعد بیٹے کے ساتھ منت پوری کرتا ہے۔

سید فصیح اللہ کاظمی کے نام ایک خط مورخہ 14/جولائی 1919ء کو اقبال لکھتے ہیں:

''تصوف کے متعلق میں خود لکھ رہا ہوں۔میرے نزدیک حافظ کی شاعری نے بالخصوص اور عجمی شاعری نے بالعموم مسلمانوں کی سیرت اور عام زندگی پر نہایت مذموم اثر کیا ہے۔اسی واسطے میں نے ان کے خلاف لکھا ہے۔مجھے امید تھی کہ لوگ مخالفت کریں گے اور گالیاں دیں گے لیکن میرا ایمان گوارا نہیں کرتا کہ حق بات نہ کہوں۔شاعری میرے لیے ذریعۂ معاش نہیں کہ میں لوگوں کے اعتراضات سے ڈروں...''

(مشمولہ خطوطِ اقبال مرتبہ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی بحوالہ تاریخ تصوف مکتبہء الحسنات دہلی، ایڈیشن 1989ء)

مگر یہ بھی نا قابل تردید حقیقت ہے کہ اقبال نے مصلحت سے کام لیتے ہوئے چونتیس 34 اشعار کا وہ بند نکال دیا جس میں حافظ شیرازی کے زہریلے اثرات سے قوم کو خبردار کیا گیا تھا اور اس کے مسلک کو گوسفندی قرار دیا گیا تھا کیوں کہ خواجہ حسن نظامی نے اقبال کا پیچھا کیا۔ اسی زمانے میں اقبال یہ اعتراف کرتے بھی دکھائی دیتے ہیں:۔

''مجھے اس امر کا اعتراف کرنے میں کوئی شرم نہیں کہ میں ایک عرصے تک ایسے عقائد و مسائل کا قائل رہا جو بعض صوفیہ کے ساتھ خاص ہیں اور جو بعد میں قرآن شریف میں تدبر کرنے سے قطعاً غیر اسلامی ثابت ہوئے۔ مثلاً شیخ محی الدین ابن عربی کا مسئلہ قدمِ ارواحِ کملاء، وحدت الوجود یا مسئلہ تنزلاتِ ستّہ۔

مذکورہ بالا تینوں مسائل میرے نزدیک مذہبِ اسلام سے کوئی تعلق نہیں رکھتے''

(وکیل ۱۵ر جنوری 1916۔ بحوالہ ''تاریخ تصوف'')

مگر بعد میں یہی اقبال جاوید نامہ میں رومی کے ساتھ منصور حلاج وغیرہ سے ملاقات کرتے ہیں یہیں آ کر تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اقبال کے فکر و فن میں اتار چڑھاؤ آتا رہا ہے۔

بدعتی اور خبیث بھی خوش تھے
ان سے اہلِ حدیث بھی خوش تھے

☆☆☆

دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

ماہ نامہ ''الحمرا'' لاہور کے سالنامے جنوری 2013ء تا اپریل 2013ء کے شماروں میں ڈاکٹر جاوید اقبال کی خودنوشت سوانح حیات ''اپنا گریباں چاک'' کے تعلق سے مختلف اربابِ نظر کی آراء نظر سے گزریں تو اس خودنوشت کے مطالعے کا اشتیاق جاگا۔ میرے کرم فرما پروفیسر غازی علم الدین، (میرپور، آزاد کشمیر) نے ازراہِ کرم پاکستان سے اپنے مطالعے کا نسخہ (اضافہ شدہ ایڈیشن اپنا گریباں چاک مطبوعہ مارچ 2006ء سنگ میل پبلی کیشنز لاہور) عنایت فرمایا۔ جس کے لیے میں ان کا بے حد ممنون ہوں۔

ڈاکٹر جاوید اقبال کا ہائی کورٹ لاہور کے چیف جسٹس کے عہدے سے باسٹھ برس کی عمر میں 1986ء میں ریٹائر منٹ ہوتے ہی اسی روز سپریم کورٹ کے جج کی حیثیت سے تقرر عمل میں آیا۔ انھوں نے ملک اور بیرون ملک کئی سمیناروں میں حصہ لیا۔ اتنے ممالک کا سرکاری سطح پر دورہ کیا کہ اقبال سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔

علامہ اقبال، نظام حیدر آباد آصف سابع میر عثمان علی خاں کے دورِ حکومت میں حیدر آباد دکن میں ہائی کورٹ کا جج بننا چاہتے تھے مگر یہ ممکن نہ ہو سکا مگر جاوید اقبال نے یہ کارنامہ انجام دیا کہ پاکستان کی عدالتِ عالیہ کے منصبِ جلیلہ سے وابستہ رہے۔

جاوید اقبال نے کئی بار عمرے کیے۔ حرمین شریفین کی زیارت سے مشرف ہوئے مگر اقبال یہ آرزو اپنے سینے میں لے کر اس دنیا سے گزر گئے اپنی ناکام آرزو کو انھوں نے جو شعری پیرایہ دیا ہے وہ یادگار بے مثال ہے۔

''اپنا گریباں چاک'' میں ڈاکٹر جاوید اقبال نے پاکستان اور بیرون پاک سیاسی صورتِ حال کا جو نقشہ کھینچا اس سے ان کی سیاسی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف انھوں نے انتخابات میں حصہ لیا اور فرزند اقبال ہونے کے باوجود شکست کھائی۔ اس کے باوجود بھٹو نے انھیں اپنے ساتھ رکھا۔ اسی طرح یہ جنرل ضیاء الحق کے کٹر اسلامی رویے سے نالاں تھے اس کے باوجود انھیں اہم اہم مواقع پر جنرل ضیاء الحق یاد فرمایا کرتے تھے اور ان سے مشورے طلب کرتے تھے۔ غرض ڈاکٹر جاوید اقبال نے بڑی کامیاب زندگی گزاری اور ان کے اپنے خیال میں یہ کامیابی انھوں نے اپنے بل پر اپنی قابلیتوں کے سہارے حاصل کی ہے۔ ان کی کامیابیوں میں اقبال کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

جاوید اقبال کی پیدائش 1924ء کی ہے اور علامہ اقبال نے 1938ء میں وفات پائی۔ گویا جس وقت باپ کا انتقال ہوا بیٹا صرف چودہ برس کا تھا۔ ڈاکٹر جاوید نے بڑی صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے بعض انکشافات بھی کیے۔ کہتے ہیں:۔

''ماہ رمضان میں گھر میں والدہ اور دیگر خواتین روزے رکھتیں اور قرآن شریف کی تلاوت کرتیں گھر کے ملازم بھی روزے رکھتے۔ البتہ میرے والد علامہ اقبال شاذونادر ہی روزہ رکھتے تھے اور جب رکھتے تھے تو ہر چند گھنٹوں کے بعد علی بخش کو بلوا کر پوچھتے کہ افطاری میں کتنا وقت باقی ہے گھر کی خواتین کو نماز پڑھتے دیکھنا مجھے یاد نہیں۔ والد کو کبھی کبھار فجر کی نماز پڑھتے ضرور دیکھا ہے جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے مجھے ماں باپ نے کبھی نماز پڑھنے یا روزہ رکھنے کے لیے مجبور

نہیں کیا۔ مجھے نہانے سے سخت نفرت تھی لیکن عید کی شب گرم پانی سے والدہ نہلاتیں اور میں بڑے شوق سے نہاتا۔ صبح اٹھ کر نئے کپڑے پہنے جاتے۔ کلائی پر باندھنے کے لیے مجھے ایک سونے کی گھڑی دی جاتی جو افغانستان کے بادشاہ نادرشاہ نے مجھے تحفے کے طور پر بھیجی تھی۔

ایک دو مرتبہ والد اور والدہ کے ساتھ سیال کوٹ بھی گیا تھا۔ تب میرے دادا بقید حیات تھے ...ان کا نام شیخ نور محمد تھا مگر شیخ نتھو کہلاتے تھے اس لیے کہ ان کی ولادت پر (ان کی) والدہ نے انھیں ناک میں نتھ پہنادی تھی۔ ان کی پیدائش سے پہلے ان کے والدین کے ہاں گیارہ لڑکے پیدا ہوئے مگر پیدا ہوتے ہی مرجایا کرتے تھے، صرف یہی بچے اور لمبی عمر پائی۔ آپ کسی مدرسے کے پڑھے ہوئے نہیں تھے"

خود اپنی پیدائش کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں:

"میری ولادت سے کچھ ماہ پیشتر میرے والد سرہند تشریف لے گئے۔ شیخ احمد سرہندی کے مزار پر حاضری دی اور دعا کی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے انھیں اولادِ نرینہ سے نوازا تو اسے ساتھ لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوں گے۔ چنانچہ جب میں تقریباً دس برس کا ہوا (۲۹ جون ۱۹۳۴ء) کو مجھے ہمراہ لے کر سرہند شیخ احمد کی بارگاہ میں حاضر ہوئے"

جاوید اقبال کو لے کر مذکورہ مزار پر منت پوری کرنے کا ذکر علامہ اقبال کے ایک مکتوب میں بھی ملتا ہے جو ۱۹۳۴ء میں لکھا گیا تھا۔ گویا مرنے سے چار برس پہلے تک بھی وہ مزاروں پر حاضری کے قائل تھے۔

اپنی جنم پتری کے بارے میں ڈاکٹر جاوید اقبال نے لکھا:

"میرے والد کے ایک ہندو دوست راجہ سر نریندر ناتھ نے انھیں میری جنم پتری بنوانے کی صلاح دی اور اس سلسلے میں اپنی خدمات پیش کیں۔ میرے والد نے میری

ولادت کی تاریخ کے ساتھ، صحیح وقت کی تفصیل بھی انھیں مہیا کردی...

شاید جنم پتری یہ معلوم کرنے کے لیے بنوائی گئی کہ مستقبل میں ان کا بیٹا اسلام کی نشاۃ ثانیہ میں کوئی نمایاں کردار ادا کرنے کے قابل ہوتا ہے یا نہیں؟''

آگے چل کر یہی بیٹا کہتا ہے:

''میں تو اپنے سال ولادت یعنی 1924ء کو عالم اسلام کے لیے نہایت اہم سال سمجھتا ہوں کہ اسی سال ترکی میں خلافت یعنی مسلم سیاسی نظام میں مطلق العنانیت کے فرسودہ تصور کا خاتمہ ہوا''

حالاں کہ یہ وہ خلافت ہے جس کا احیا اقبال چاہتے تھے کہ ان کے نزدیک خلافت ہی مثالی اسلامی حکومت ہے جس کا سربراہ خلیفۃ المومنین کہلاتا ہے مگر ریاست کا ہر فرد بلا جھجک حضرتِ عمرؓ جیسے خلیفہ کو ٹوک سکتا ہے اور اُن سے جواب طلب کرسکتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب وجگر

یہ وہی خلافت ہے جس کی بقا کے لیے مولانا محمد علی شوکت علی کے ساتھ ساری ملت نے تن من دھن کی بازی لگائی تھی اور گاندھی جی نے بھی ہم نوائی کی تھی۔ یہ وہی اقبال ہے جس نے کبھی کہا تھا۔

ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا
وہ خود فراخیِ افلاک میں ہے خوار و زبوں

ڈاکٹر جاوید اقبال اپنی والدہ سردار بیگم کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ان کا انتقال 23 مئی 1935ء کو بیالیس سال کی عمر میں ہوا جب وہ گیارہ سال کے اور ان کی بہن منیرہ پانچ سال کی تھیں۔ مرنے سے پہلے سردار بیگم نے علامہ اقبال کی ایماء پر تھوڑے سے پس و پیش کے بعد جاوید منزل اپنے بیٹے جاوید کے نام ہبہ کر دی۔ علامہ اقبال نے ایک کرایہ نامہ تحریر کیا اور تین کمروں میں رہائش کا پیشگی کرایہ ہر ماہ کی اکیس تاریخ کو ادا کر دیا کرتے تھے۔

آگے چل کر حکومتِ پاکستان نے ''جاوید منزل'' منہ مانگے دام دے کر خرید لی اور جنرل ضیاء الحق کے حکم پر رقم ادا کر دی گئی اور اس میں اقبال میوزیم کا افتتاح بھی جنرل ضیاء الحق ہی نے کیا۔ جاوید منزل کی فروخت سے جو معقول رقم حاصل ہوئی اس سے ڈاکٹر جاوید اقبال نے ایک عالی شان مکان تعمیر کروایا (جہاں وہ آخری سانس تک رہتے تھے)۔ علامہ اقبال نے جو مکان اپنی بیوی کے نام پر تعمیر کیا تھا اور جسے انھوں نے جاوید کے نام ہبہ کروایا تھا وہی جاوید کے نئے مکان کی بنیاد بنا۔

علامہ اقبال کی پہلی بیوی سے دو بچے ہوئے آفتاب اقبال اور معراج بیگم (جو جوانی میں فوت ہو گئیں)۔ اس طرح شاید اقبال اپنی جائیداد کو پہلی بیوی کی اولاد سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اسے دوسری بیوی سردار بیگم (والدہء جاوید) کے نام پر خریدا اور پھر سردار بیگم کے مرنے سے پہلے اسے جاوید کے نام ہبہ بھی کروا دیا تا کہ آگے چل کر کوئی مسئلہء وراثت کھڑا ہونے نہ پائے۔ ویسے شریعت کے مطابق باپ اپنے کسی بچے کو اپنی جائیداد سے بے دخل نہیں کر سکتا۔ علامہ اقبال اپنے بڑے بیٹے آفتاب اقبال سے نالاں ضرور تھے اور آفتاب نے بھی علامہ کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ یہ تلخ حقیقت بھی اپنی جگہ ہے۔

ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنی خودنوشت سوانح کے تیرھویں باب میں علامہ اقبال کے نام ایک بہت ہی معلوماتی ''دوسرا خط'' لکھا ہے جس میں انھوں نے اپنے والد کے عقائد پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ مثلاً

۱۔ آپ (علامہ اقبال) کی رائے خاندانی منصوبہ بندی سے متعلق قانون سازی کے حق میں ہے۔ (صفحہ 282)

۲۔ آپ (اقبال) ایک سے زائد از دواج (ازواج) کے امتناع کو شرعاً جائز قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ معاشرتی حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسلامی ریاست کا سربراہ کسی بھی قرآنی حکم یا اجازت کی تعویق، تحدید یا توسیع کر سکتا ہے۔ (صفحہ 282)

۳۔ مولانا شبلی (نعمانی) کی طرح آپ (علامہ اقبال) مسلمانوں میں فری مارکیٹ اکانومی FREE MARKET ECONOMY کے فروغ کی خاطر بینکوں کے منافع کو ربوا (سود) کے زمرے میں نہیں لاتے۔ (صفحہ 282)

۴۔ علامہ اقبال کے نزدیک جنت اور دوزخ مقامات نہیں بلکہ احوال یا کیفیات ہیں... (صفحہ 282)

۵۔ اقبال کے خیال میں تو جنت بھی مستقل عشرت کدہ یا مسلسل عیش و آرام کا کوئی مقام نہیں بلکہ انسان موت کے بعد اگر چاہے تو حیات کا تسلسل ختم کر کے ہمیشہ کے لیے نیست و نابود ہو سکتا ہے۔ ایسی روحانی خودکشی کا اسے اختیار ہے 318

۶۔ علامہ اقبال کا قول ہے ''بدی کی اپنی ایک تعلیمی حیثیت ہے، نیک لوگ عموماً بے وقوف ہوتے ہیں'' (اپنی سادہ لوحی کے سبب) (صفحہ 254)

مخفی مباد نظام دکن آصف جاہ سابع میر عثمان علی خاں کے دورِ حکومت میں ایک تحصیلدار کی ماہانہ تنخواہ دس بارہ روپے (حالی) سے زیادہ نہیں ہوا کرتی تھی۔خوش حالی کے اس دور میں اتنے مشاہرے میں وہ عیش کیا کرتا تھا۔علامہ اقبال کا اپنے بچوں کی آیا (گورنس) کو ماہانہ پچاس روپے تنخواہ دینا گویا حاتم کی قبر پر لات مارنا ہے۔اپنی بیوی کے انتقال کے بعد علامہ اقبال نے اپنے بچوں کی نگہداشت کے لیے ایک جرمن خاتون ڈورسِ کو ماہانہ پچاس روپے پر اپنے گھر رکھا جن کی بہن علی گڑھ یونیورسٹی میں بیالوجی کے پروفیسر کی اہلیہ تھیں۔ان سے ملنے ڈورس آئی تھیں۔مگر پروفیسر رشید احمد صدیقی کی ترغیب پر وہ علامہ اقبال کے بچوں کی گورنس بن کر لاہور آ گئیں۔اس طرح اقبال کے گھر کا ماحول، رہن سہن مغربی انداز کا ہو گیا بچے بہت خوش ہوئے۔اقبال چونکہ جرمن زبان جانتے تھے وہ ڈورس سے جرمن ہی میں گفتگو کیا کرتے تھے۔اپنی بیٹی منیرہ سے بھی کہتے تھے کہ جرمن زبان سیکھے۔

اقبال کے بھائی نے منیرہ کے لیے ایک چھوٹا سا برقع (غالباً مقنع) تحفتاً بھیجا تو ڈورس سخت غصے میں آئیں۔اقبال ہنس دیئے اور فرمایا ''میرے بڑے بھائی نے یوں منیرہ کے لیے اپنی محبت کا اظہار کیا ہے۔آپ ان کا تحفہ رکھ لیں۔ضروری نہیں کہ منیرہ یہ برقع (مقنع) اوڑھے اور میں تو یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ جب منیرہ بڑی ہو گی تو خواتین میں پردہ رہے گا بھی یا نہیں''۔یہ غالباً مقنع تھا جو چھوٹی بچیوں کو بطورِ تربیت شرعی گھرانوں میں پہنایا جاتا ہے۔ڈاکٹر جاوید نے لکھا:

''منیرہ کے لیے وہ ننھا سا برقع اچھا خاصہ تماشا تھا۔وہ برقع پہنے گھر میں ادھر ادھر بھاگتی پھرتی۔حتٰی کہ اس بھاگ دوڑ میں برقع پھٹ کرنا کارہ ہو گیا۔''

ڈورس کے بحیثیت گورنس تقرر سے پہلے کوئی مسلم خاتون بھی رجوع ہوئی تھیں مگر اُس برقع

پوش خاتون کی شرط تھی کہ اقبال اس سے نکاح پڑھوالیں مگر اقبال نے اسے ہنس کر ٹال دیا۔ جاوید اقبال لکھتے ہیں:

''وہ نہایت رجعت پسند قسم کی مسلمان لگتی تھیں۔ برقع پوش تھیں۔منیرہ نے انھیں دیکھتے ہی مسترد کردیا تھا''

غالباً وہ دیندار خاتون ایک غیر محرم کے ساتھ ایک ہی چھت کے تلے رہنے کا کوئی شرعی جواز چاہتی تھیں۔لیکن اقبال آخری عمر میں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتے تھے۔مغربی تعلیم کے مدرسوں میں پڑھنے والے بچوں نے خود بھی اس خاتون کو رد کردیا۔

وہ اقبال جس نے اکبر اعظم کی طرح ایک بزرگ کے مزار پر جاکر ایک بیٹے کے لیے منت مانگی اور منت پوری کرنے کے لیے اپنے بیٹے کو لے کر شیخ احمد سرہندی کے مزار پر حاضری بھی دی، وہ اقبال جس نے بچوں کی خاطر کوئی دوسرا نکاح نہیں کیا بلکہ تعدد ازدواج پر امتناع کو شرعاً جائزہ قرار دیا تھا، وہ اقبال جس نے ڈاکٹروں کے مشورے کے باوجود وی آنا (آسٹریا) جاکر اپنے گلے کی تکلیف کا علاج کروانا پسند نہیں کیا کہ اس طرح (اپنے علاج پر) روپیہ خرچ کر کے وہ اپنے بچوں کی آئندہ بہتر زندگی کا حق غصب کرنا نہیں چاہتا تھا بلکہ بھوپال کے نواب کی پیش کش قبول کر کے بجلی کے جھٹکوں کے ذریعے مفت علاج کرواتا رہا، وہ اقبال جو جاوید منزل کا مالک ہوتے ہوئے بھی، جاوید کو ہر ماہ پابندی سے کرایہ ادا کرتا تھا، وہ اقبال جو یہ چاہتا تھا کہ اس کا بیٹا باضابطہ DISCIPLINED زندگی گزار کر سرخ رو ٹھیرے۔ایسے صاحبِ ایثار باپ کے فرزند ڈاکٹر جاوید اقبال فرماتے ہیں:

''والد کی وفات کے بعد میں ان کے نافذ کردہ ڈسپلن سے آزاد ہوگیا۔جن باتوں سے انھوں نے منع کر رکھا تھا میں نے بڑی رغبت سے ان میں سے ہر ایک کو اپنایا۔صحیح و غلط میں

غلط ۔اور نیکی و بدی میں ۔بدی کا رستہ منتخب کرنا بہتر سمجھا۔اگر سرِ شام گھر میں موجود رہنے کا حکم تھا تو میں آدھی رات سے پہلے گھر میں قدم نہ رکھتا تھا۔اگر سینما دیکھنا منع تھا تو ہر روز دو دو بلکہ تین تین شو دیکھتا ۔روزمرہ کے باورچی خانے کا حساب لکھتے وقت پیسوں میں گھپلا کرتا۔رنگ برنگی ریشمی قمیصیں، مہنگے ولایتی بوٹ اور یورپی انداز کے سلے ہوئے سوٹ ،نکٹائیاں،اوورکوٹ، دستانے ،اورفلٹ ہیٹ زیب تن کرتا، مئے نوشی ، یورپی طرز کے رقص اوررات کے کھانے کے لیے معروف جگہوں (پر جاتا)۔''

اور تو اور جاوید اقبال کو بہت گراں گزرتا ہے جب لوگ انھیں علامہ اقبال کے حوالے سے یاد کرتے ہیں۔ان کی انا کو ٹھیس لگتی ہے۔انہوں نے کتاب کے پیش لفظ میں صاف صاف لکھا:

- ''میں عمر میں پاکستان سے بڑا ہوں۔میرے والد علامہ محمد اقبال ایک عظیم شاعر، فلسفی اور تصورِ پاکستان کے خالق سمجھے جاتے ہیں۔ان کے فرزند ہونے کی حیثیت سے زندگی کے مختلف ادوار میں میرا ردِعمل مختلف رہا ہے۔
- بچپن میں باپ کے حوالے سے پہچانا گیا تو میں نے برا نہیں مانا کیونکہ مجھے علم ہی نہیں تھا کہ وہ کون ہیں اور کیا کرتے ہیں۔
- جوان ہوا تب بھی باپ کے حوالے سے پہچانا گیا۔یہ میرے لیے پدرم سلطان بود کی بناء پر فخر کا مقام تھا۔
- زندگی میں اچھا برا مقام پیدا کیا تب بھی باپ کے حوالے سے پہچانا گیا تو مجھے برا لگا۔یہ میری ''انا'' کی نشوونما میں مداخلت تھی۔
- اب بوڑھا ہو چکا ہوں،تب بھی باپ کے حوالے سے میری شناخت ہوتی ہے۔

عجیب اتفاق ہے میرے والد کے پرستاروں نے مجھے بڑا ہونے نہیں دیا۔

بہر حال میں نے کن حیلوں سے ایک بہت بڑے درخت کے سائے سے نکل کر اپنا مقام پیدا کرنے کی کوشش کی یہی میری داستانِ حیات ہے''۔

علامہ اقبال سے تعلق کو بوجھ سمجھنے والے فرزند کے تعلیمی مدارج کا یہ حال ہے کہ ساتویں جماعت میں فیل، نویں جماعت میں فیل، ایف۔اے تھرڈ کلاس پاس، بی۔اے دوسرے درجے میں کامیاب، ایم۔اے فیل، بارایٹ لا فیل، (دونوں دوسری بار کامیاب) انتخابات میں ذوالفقار علی بھٹو کے بالمقابل ناکام۔

اتنی ناکامیوں کے باوجود وہ ہائی کورٹ کے جج بنائے گئے اور جس دن ریٹائر ہوئے اسی دن سپریم کورٹ کے جسٹس بنائے گئے۔کیا میرٹ کی بنیاد پر یہ ممکن تھا علامہ اقبال کے فرزند ہونے کے ''رعایتی نشانات'' ہی تو ان کے کام آئے۔

پوری کتاب میں اپنے باپ کی اتنی تعریف نہیں جتنی ڈاکٹر جاوید اقبال اپنی بیوی ناصرہ کی شان میں کرتے ہیں یہاں تک کہ جاوید منزل کی (حکومت کے ہاتھ بیچ کر) حاصل شدہ رقم سے تعمیر کردہ دومنزلہ عمارت بھی ناصرہ بیگم کے نام ہبہ کردی۔حکومتِ برطانیہ نے اقبال کے فکروفن کے اعتراف میں انھیں ''سر'' کے خطاب سے سرفراز فرمایا تھا جس کا ذکر ڈاکٹر جاوید نے کہیں نہیں کیا حالانکہ ٹیگور کی طرح اقبال نے سر کے خطاب سے دست برداری کا اعلان نہیں کیا تھا۔

جگن ناتھ آزاد کو سلام کرنے کو جی چاہتا ہے جنھیں نہ صرف علامہ اقبال کا تقریباً کلام حفظ تھا بلکہ وہ اقبال کے حوالے سے پہچانے جانے پر نازاں بھی تھے۔ایسے وقت جب کہ ہندوستان میں اقبال کا نام لینا بھی جرم کے مماثل تھا، جگن ناتھ آزاد نے سرکاری سطح پر

علامہ کی شاعرانہ حیثیت کا احساس کروایا۔ ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' کو ترانے کا درجہ دلایا جو آج بھی برقرار ہے۔ بہ ذاتِ خود وہ جیسے بھی شاعر رہے ہوں، علامہ اقبال جیسے برگد کے زیرِ سایہ سانس لینے ہی میں زندگی سمجھتے تھے۔

علامہ اقبال کے پرستار اور ہم جلیس راجہ حسن اختر کے بیٹے محمود اختر کیانی کی اقبال سے عقیدت کا یہ حال تھا کہ وہ انھیں اپنا تایا سمجھتے تھے اور اگر کوئی ناہنجار کسی بھی سطح پر اقبال کے خلاف کسی قسم کی تنقید کرتا تو مرنے مارنے پر تیار ہو جاتے۔ (گھنگھرو ٹوٹ گئے۔ قتیل شفائی)

''اقبال کی خامیاں'' تلاش کرنے والے لبھو رام جوش ملسیانی کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ وہ کتابچہ اپنے نام سے شائع کروائے تاہم جس کا دنداں شکن جواب شمس الرحمٰن فاروقی نے دیا۔ کشمیر کے ڈاکٹر بشیر احمد نحوی سے لے کر جنوبی ہند کے سید احمد ایثار، بہادر یار جنگ، مضطر مجاز اور رؤف خیر تک اقبال کے چاہنے والوں کا ایک قافلہ ہے جو رواں دواں ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ علامہ اقبال سے پہلے بھی کوئی ''خدائے سخن'' نہیں اور اقبال کے بعد شاعری کا دعویٰ کرنا، نبوت کا دعویٰ کرنے کے برابر ہے، زیادہ سے زیادہ اولیائے غزل اور اوصیائے نظم ہو سکتے ہیں۔

(یہ مضمون جاوید اقبال کی زندگی میں لکھا گیا تھا)



بچوں کا اقبال

مناسب الفاظ کو مناسب جگہوں پر استعمال کرنے کا ہنر ہی شاعر اور ادیب کی شناخت قائم کرتا ہے۔اسی طرح مناسب رنگوں کا مناسب خطوط کے لیے برتنا ہی ایک فن کار کو حقیقی معنوں میں فن کار بناتا ہے۔اقبال کو جب ہم اس تناظر میں دیکھتے ہیں تو اقبال کی قد آوری کو تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آتا۔جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں بچوں کے لیے بچوں کی سطح پر اتر کر سلیس پیرایہ اظہار اختیار کرنا کس قدر مشکل کام ہے اور اقبال جیسے بے انتہا پڑھے لکھے Well-Versed آدمی کے لیے یہ کچھ زیادہ مشکل ہو جاتا ہے کیونکہ جو آدمی محدود علمیت کا حامل ہو اس کی حدود متعین کی جا سکتی ہیں جبکہ اقبال کسی دائرے میں قید نہیں کیے جا سکتے۔وہ نہ صرف اردو ادب کے ماضی و حال سے کما حقہ واقف تھے بلکہ ان کی نظر فارسی انگریزی، سنسکرت اور جرمن ادب پر بھی بڑی حد تک تھی۔اس منزل پر پہنچ کر اقبال اگر بچوں کے لیے بچوں کی زبان میں سلیس پیرایہ اختیار کرتے ہوئے چھوٹے چھوٹے موضوعات پر بڑی اہم بات کر جاتے ہیں تو یہ اقبال ہی کا حصہ ہے۔اقبال سے اک ذرا پہلے اسمٰعیل میرٹھی خاص طور پر بچوں کے لیے بہت خوب صورت نظمیں لکھ رہے تھے۔ اقبال کو اک سہولت یہ حاصل تھی کہ ان کے سامنے انگریزی ادب کی بے شمار نظمیں تھیں جن سے اردو ادب کو روشناس کروایا تھا چنانچہ اقبال نے ان نظموں سے استفادہ کیا۔اقبال کی بیشتر نظمیں جو بچوں کے لیے لکھی گئیں وہ انگریزی ادب سے ماخوذ ضرور ہیں مگر ان میں

جو آب ورو غن ہے وہ خالص مشرقی انداز کا ہے۔اقبال کی بڑائی ہے کہ انہوں نے ان نظموں کے ماخذ کی نشان دہی کر دی ورنہ ان اردو نظموں کا انگریزی نظموں سے تقابل کرنا دشوار ہی ثابت ہوتا۔مثلاً اقبال کی اک نظم ''بچے کی دعا'' ہےاس کو اقبال نے ماخوذ قرار دیا ہےاس پر ہر چند کہ شاعر کا نام درج نہیں ہے مگر تحقیق کرنے پر کھلا کہ یہ دراصل میٹلڈا بیتھم Metilda Betham کی نظم A Child's hymn کے خیال سے اٹھائی ہوئی ہے مگر اردو میں آ کر اس نے جو رنگ اختیار کر لیا وہ خالص مشرقی بلکہ اسلامی ہے۔

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری
دور دنیا کا مرے دم سے اندھیرا ہو جائے
ہر جگہ میرے چمکنے سے اجالا ہو جائے
میرے اللہ برائی سے بچانا مجھ کو
نیک جو راہ ہو اس رہ پہ چلانا مجھ کو

نیک راستے کی دعا وہی کر سکتا ہے جس کے رگ و ریشہ میں اھدنـا الصراط المستقیم کی دعا رچ بس گئی ہو۔

بچوں کے لیے اقبال کی پہلی نظم جو ''بانگ درا'' میں ہمیں ملتی ہے وہ ہے ''ایک مکڑا اور مکھی'' یہ دراصل میری ہاوٹ Mary Howitt (1799-1888) کی انگریزی نظم The Spider and the Fly سے ماخوذ ہے۔

اک دن کسی مکھی سے یہ کہنے لگا مکڑا — اس راہ سے ہوتا ہے گزر روز تمہارا
لیکن مری کٹیا کی نہ جاگی کبھی قسمت — بھولے سے کبھی تم نے یہاں پاؤں نہ رکھا

اور مکھی اسے صاف جواب دے جاتی ہے۔

اس جال میں مکھی کبھی آنے کی نہیں ہے
جو آپ کی سیڑھی پہ چڑھا پھر نہیں اترا

لیکن یہاں سے نظم اک نیا موڑ لیتی ہے۔شاعر بتاتا ہے کہ کس طرح خوشامد سے سو کام نکلتے ہیں۔ وہ مکڑا بڑی صفائی سے مکھی کے حسن کی تعریف شروع کرتا ہے۔

آنکھیں ہیں کہ ہیرے کی چمکتی ہوئی کنیاں
سر آپ کا اللہ نے کلغی سے سجایا
یہ حسن یہ پوشاک یہ خوبی یہ صفائی
پھر اس پہ قیامت ہے یہ اڑتے ہوئے گانا

اس کے بعد مکھی کا جو حشر ہونا تھا سو ہوا۔اقبال اس نظم کے ذریعہ جہاں یہ کہتے ہیں کہ خوشامد سے سو طرح کے کام نکالے جاسکتے ہیں وہیں ایک دوسرا اور بڑا اہم درس وہ یہ بھی دیتے ہیں کہ خوشامدی بہر حال اپنے ممدوح کو ظل الٰہی یا شہنشاہ عالم کہہ کہہ کر (ان شہنشاہ عالم کی دسترس از دلی تا پالم ہی کیوں نہ ہو) لوٹتے ہیں۔

اقبال جانتے تھے کہ خودی کا درس دینے کے لیے کچے ذہن زیادہ کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں اور اس کے لیے ان کو انہی کی زبان میں خودی کی اہمیت دکھائی جائے۔خودی کا یہ درس ممکن ہے اقبال نے شعوری طور پر دیا ہو مگر آج ہم سوچتے ہیں تو یہ اقبال کی دوراندیشی نظر آتی ہے۔ہر چند کہ بات غیر کے حوالے سے سہی اقبال کی بات اس طرح پہنچ تو جاتی ہے۔نظم ''ایک پہاڑ اور گلہری'' پر ماخوذ از ایمرسن لکھا ہوا ہے۔یہ دراصل ایمرسن کی نظم The Mountain and the Squirrel سے اٹھایا ہوا خیال ہے۔

کوئی پہاڑ یہ کہتا تھا اک گلہری سے... کہ... تری بساط ہے کیا میری شان کے آگے

گلہری اسے جواب دیتی ہے۔

بڑا جہان میں تجھ کو بنادیا اس نے　　مجھے درخت پہ چڑھنا سکھادیا اس نے
جو تو بڑا ہے تو مجھ سا ہنر دکھا مجھ کو　　یہ چھالیہ ہی ذرا توڑ کر دکھا مجھ کو
نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں　　کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

اس نظم میں اک درس خودی ملتا ہے۔گلہری کی خودی پہاڑ سے کمتر نہیں اور یہ بات اگر بچے کے ذہن نشین ہو جائے تو وہ مستقبل کا بہت بڑا آدمی بن سکتا ہے بشرطیکہ وہ اس خودی کی تربیت کرے۔اقبال شعوری طور پر بچے کو قد آوروں سے آنکھ ملانا سکھاتے ہیں۔

اسی تربیت کو آگے بڑھاتی ہوئی اقبال کی اک اور نظم ''ہمدردی'' ہے جو ولیم کوپر William Cooper کی نظم Nightingale and the glow-worm سے ماخوذ ہے

ٹہنی پہ کسی شجر کی تنہا　　بلبل تھا کوئی اداس بیٹھا
کہتا تھا کہ رات سر پہ آئی　　اڑنے چگنے میں دن گزارا
پہنچوں کس طرح آشیاں تک　　ہر چیز پہ چھا گیا اندھیرا
سن کر بلبل کی آہ و زاری　　جگنو کوئی پاس ہی سے بولا
حاضر ہوں مدد کو جان و دل سے　　کیڑا ہوں اگر چہ میں ذراسا
کیا غم ہے جو رات ہے اندھیری　　میں راہ میں روشنی کروں گا
اللہ نے مجھ کو دی ہے مشعل　　چمکا کے مجھے دیا بنایا

پھر آخر میں فیصلہ سنیئے۔

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے　　آتے ہیں جو کام دوسروں کے

کوئی چیز بجائے خود بڑی حقیر ہو سکتی ہے لیکن وہ بڑے کام کی بھی ہو سکتی ہے اور پھر جہاں جذبہ ء ہمدردی بھی شامل ہو تو پھر تو اس کا چھوٹا پن، چھوٹا پن نہیں رہ جاتا۔

اقبال کی اپنی کوشش یہ لگتی ہے کہ نئی نسل میں وہ تمام اعلیٰ صفات پیدا ہوں جو ایک انسان کامل کے لیے ضروری ہیں اس طرح اقبال نے بچوں کو محض کھلونے دے کر بہلانے کی کوشش نہیں کی بلکہ انھیں زمانے کا نرم و گرم سمجھایا ہے اور اس زندگی میں ان کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔

اک اور نظم ''ایک گائے اور بکری'' پر بھی صرف ماخوذ لکھا ہوا ہے۔ یہ دراصل جین ٹیلر Jane Taylor کی انگریزی نظم The Cow and the Ass سے استفادہ ہے۔ اقبال کی جمالیات نے ''گدھے'' کو قبول نہیں کیا انہوں نے اسے بکری کا روپ دے دیا اور نظم کو کافی بدل دیا گدھے کی جگہ بکری کی خصوصیات کے حوالے سے اک اہم بات کہی گئی ہے۔ گائے کے گلے کے جواب میں بکری اسے سمجھاتی ہے۔

یہ مزے آدمی کے دم سے ہیں   لطف سارے اسی کے دم سے ہیں
یوں تو چھوٹی ہے ذات بکری کی   دل کو لگتی ہے بات بکری کی

اس نظم میں بھی اقبال اپنے منصب سے ہٹتے نظر نہیں آتے یہاں بھی کائنات میں انسان کی اہمیت کا احساس دلاتے ہیں۔

ان نظموں کے علاوہ ''ماں کا خواب'' اقبال کی وہ نازک احساسات پر مبنی نظم ہے جو یوں تو W. Barnes بارنس کی نظم The Mother's Dream سے استفادہ ہے مگر اقبال اس نظم میں بھی داخل ہیں۔ صبر جمیل کی تلقین اور اس قدر ڈرامائیت کے ساتھ اقبال ہی کر سکتے تھے۔ ماں اپنے مرحوم لڑکے کے غم میں اکثر روتی رہتی ہے اور ایک رات

اس کو خواب میں دیکھتی ہے اسے ملال یہ ہوتا ہے کہ اس کے نور نظر کے ہاتوں میں جو دیا ہے وہ جلتا دکھائی نہیں دیتا لڑکا اسے اس کا سبب بتاتا ہے۔

سمجھتی ہے تو ہوگیا کیا اسے
ترے آنسوؤں نے بجھایا اسے

ہر چند کہ یہ نظم بارنس کی نظم سے ماخوذ ہے مگر "ماں" کی جو حیثیت مشرق میں ہے وہ طے ہے کہ مغرب میں نہیں۔اس نظم کا اردو ادب میں بلکہ مشرقی شعریات میں جو مقام ہے اس کے پیش نظر اس کا صحیح لطف تو یہیں اٹھایا جاسکتا ہے۔ ہماری مائیں کس قدر درد بھرے دل کی مالک ہوتی ہیں یہ ہم بخوبی جانتے ہیں انھیں صبر کی تلقین کرنا کوئی آسان کام نہیں مگر چھوٹے بچے کے حوالے سے اقبال مشرقی ماں کے آنسو پونچھتے ہیں۔

اقبال کے اسلوب کی ایک اور شاہ کار نظم "پرندے کی فریاد" ہے جو خالص طبع زاد نظم لگتی ہے اور یہ ماخوذ ہو بھی نہیں سکتی تھی کیونکہ اس نظم میں جو المیہ بیان کیا گیا ہے وہ تو بس ہندوستانی پس منظر ہی میں سمجھا جاسکتا ہے۔ پرندے کی علامت اور پھر پرندے کی رعایت سے آشیانہ، قفس، چمن اور اس کے دیگر لوازمات دراصل آزادی کی جدو جہد یا آزادی کی خواہش اور حصول کا پس منظر لیے ہوئے ہیں۔اس نظم میں اقبال نے اس دور غلامی کی عکاسی بڑے درد انگیز لہجے میں کی ہے۔

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ
وہ باغ کی بہاریں وہ سب کا چہچہانا
اس قید کا الٰہی دکھڑا کسے سناؤں
ڈر ہے یہیں قفس میں میں غم سے مر نہ جاؤں

اور پرندہ آخر کار اپنے صیاد سے گزارش کرتا ہے۔

آزاد مجھ کو کردے او قید کرنے والے
میں بے زباں ہوں قیدی تو چھوڑ کر دعا لے

اس نظم میں پرندہ ایک اہنساوادی نظر آتا ہے۔ اہنساوادی ہونا بھلے ہی اس کی مجبوری سہی صیاد کے جذبہ ترحم کو للکارنا بھی ایک آرٹ ہے اور اس نظم میں یہ آرٹ اپنے دور کی عکاسی کرتا ہوا ہے اور عروج پر ہے۔ اس نظم کا بنیادی خیال ولیم کوپر کی نظم سے اقبال نے لیا ہے۔ وہ ہے On a Gold-Pinch Starred to Death in his Cage

اقبال کی اک نظم ''طفل شیر خوار'' کا ذکر کئے بغیر میری بات ادھوری رہ جائے گی۔ ہر چند کہ اس نظم پر کہیں یہ لکھا ہوا نہیں ہے کہ یہ بچوں کے لیے ہے مگر ایسے لگتا ہے کہ جو بچہ اقبال کی ابتدائی نظموں میں پایا جاتا تھا وہ ابھی سن شعور کو نہیں پہنچا ان کی یہ عین تمنا ہے کہ وہ اسے ہتھیاروں سے کھیلنے سے باز رکھیں۔ نظم یوں شروع ہوتی ہے۔

میں نے چاقو تجھ سے چھینا ہے تو چلاتا ہے تو
مہرباں ہوں میں، مجھے نامہرباں سمجھا ہے تو
پھر پڑا روئے گا اے نووارد اقلیم غم
چبھ نہ جائے دیکھنا باریک ہے نوک قلم
آہ کیوں دکھ دینے والی شئے سے تجھ کو پیار ہے
کھیل اس کاغذ کے ٹکڑے سے یہ بے آزار ہے

آگے چل کر شاعر اس طفل شیر خوار کو سمجھاتے ہوئے جو بات کہتا ہے وہیں سے نظم اک عجیب وغریب موڑ لیتی ہے۔ فلسفے کی ایک دنیا اس چھوٹی سی نظم میں سموئی ہوئی ہے۔ دنیا کی ظاہری

چمک دمک اوراس کی بے ثباتی کا جس خوب صورت لہجے میں اقبال نے ذکر کیا ہے اوراپنی نادانی کا جواعتراف کیا ہے اس پر ہزار دانائی قربان۔

میری آنکھوں کو لبھا لیتا ہے حسن ظاہری
کم نہیں کچھ تیری نادانی سے نادانی مری
تیری صورت گاہ گریاں گاہ خنداں میں بھی ہوں
دیکھنے کو نوجواں ہوں، طفل ناداں میں بھی ہوں

اقبال کی اسی نادانی نے انھیں دانائی کی اس منزل پر پہنچا کر دم لیا جہاں فرشتوں کے پر جل جاتے ہیں۔

اقبال اس بات کے قائل تھے کہ دانائی وفراست کی بات مومن کا کھویا ہوا خزانہ ہے لہذا ادبیاتِ عالم سے استفادے کوانہوں نے کبھی عار نہ جانا۔حتیٰ کہ اپنے پیش روشاعر اسمعیل میرٹھی کی مشہور زمانہ نظم ''بارش کا پہلا قطرہ''

گھنگھور گھنا تلی کھڑی تھی پر بوند ابھی نہیں پڑی تھی

اسے اقبال نے نئی زندگی بخشی اور ''قطرہ آب'' کے عنوان سے یہ کہتے ہوئے فارسی کا جامہ پہنا دیا کہ اگر گفتہ شد باز گویم بجاست بات اگر اہم ہو تو ہزار پیرایوں میں دہرا دہرا کر کہنے سے وہ دل میں جگہ پاتی ہے۔یہ تو خاص قرآنی ڈکشن ہے بانگ درا کی بیشتر ابتدائی شاعری کی مخاطب نئی نسل ہے۔اقبال غلامی سے سخت متنفر اور آزادی کے متوالے تھے۔ ہندوستان سے ان کو جو جذباتی لگاؤ تھا وہ ان کی کئی نظموں میں بولتا دکھائی دیتا ہے۔ ہر بڑا فن کار غیر متعصب ہوتا ہے۔کیونکہ

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا

اقبال تو فرقہ بندی کے سخت خلاف تھے ان کی مشہور نظم ''نیا شوالہ'' کی فیصلہ کن بیت ہے۔

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

اقبال نے ہندوستانی بچوں کا قومی گیت لکھ کر یہ بتا دیا کہ مسلمانوں کے دلوں میں ہندوستان کی کتنی وقعت و اہمیت ہے۔ میر عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے۔

جو ترانہ اقبال نے دیا وہ تو آج بھی قومی ترانہ شمار ہوتا ہے۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

یہ ایک فطری تقاضہ ہے کہ آدمی کو اپنا گھر، اپنی گلی، اپنا شہر اور اپنا ملک بہر حال عزیز ہوتا ہے۔

اقبال نے رام، گرونانک، گوتم بدھ اور دیگر اوتاروں کو خراج عقیدت پیش کر کے یہ ثابت کیا کہ نونہالوں کو ایک دوسرے کے مذہب اور احساسات کا ہر طرح خیال رکھنا سکھانا چاہیے اور ایک سیکولر ملک میں یہی کچھ تو ہونا چاہیئے۔ ہر شہر ملک اور ہر شخص ''انسانیت'' کی بنیاد پر ہی سر و شانہ بلند Head & Shoulders Above ہو سکتا ہے۔ (اقبال کی مثال سامنے ہے) یہی اقبال کا پیام تھا یہی گاندھی اور نہرو کا خواب تھا یہی میری آرزو ہے اور مجھے یقین ہے یہی آپ کا خیال بھی ہوگا۔

☆☆☆

فضائلِ اقبال

اکثر کہا جاتا ہے کہ اسلوب ہی شخصیت ہے یعنی Style is the Person مگر یہ جامع خیال نہیں ہے کیوں کہ اسلوب جامد نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ شخصیت بدلتی رہتی ہے اسی طرح اسلوب بھی بدلتا رہتا ہے اور ضروری نہیں کہ اسلوب ترقی پذیر ہی ہو، زوال آمادہ بھی ہوسکتا ہے۔ مثلاً قرآن وسنت پر شدت کے ساتھ عمل کرنے والی کوئی شخصیت بعض وقت اتنی زیادہ تعقل پسند Rationalist ہوجاتی ہے کہ منکرحدیث ہوجاتی ہے۔ اور یہ شخصیت اپنے طور پر خود کو اعلیٰ وارفع سمجھتے ہوئے ترقی پر گامزن سمجھتی ہے اور دوسروں کو چشمِ کم سے دیکھتی ہے اور ظاہر ہے دوسروں کی رائے ایسی شخصیت کے بارے میں بھی اچھی نہیں ہوتی۔ جیسے سر سیّد احمد خان، اسلم جیراج پوری، چراغ علی، غلام احمد پرویز، غلام جیلانی برق (اس میں اور بھی غلاموں کے نام آپ شامل کر سکتے ہیں)۔ شخصیت کی تبدیلی کے ساتھ طرزِ حیات وطرزِ تحریر میں بھی تبدیلی آتی ہے۔ یہ تبدیلی اس شخصیت کے عروج وزوال کی نشان دہی کرتی ہے۔

علامہ اقبال کی شخصیت اور ان کی فکر میں بھی کافی تبدیلیاں رونما ہوتی رہی ہیں۔ اردوادب کا سب سے زیادہ پڑھا لکھا شاعر اگر کوئی ہے تو وہ علامہ اقبال ہیں۔ لوگ بھلے ہی میرؔ یا انیسؔ کو خدائے سخن کہہ لیں مگر علامہ اقبال کی ادبی خدمات کے بالمقابل ان کی خدائی چھوٹی پڑجاتی ہے۔ دل رکھنے کے لئے یہ کہنے والا

غالبؔ اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخؔ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میرؔ نہیں

یہ بھی تو کہتا ہے:

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

پوری دلّی میں ڈھائی پونے تین شاعروں کے وجود کو بادل نخواستہ تسلیم کرنے والے اور خود کو اژدہا اور دیگر شعرا کو حشرات الارض[کیڑے مکوڑے] سمجھنے والے میر کے بارے میں یہ بھی کہا گیا کہ ان کے ہاں گھٹیا شعر بھی بہت ہیں پستش غایت پست-غرض ہر شاعر کے فکر وفن میں اچھی بری مثالیں مل ہی جاتی ہے۔

علامہ اقبال نے بچوں کے لئے جو نظمیں لکھیں وہ اپنی جگہ منفرد شاہ کار ہیں۔اس میں شک نہیں بعض نظمیں انگریزی نظموں سے ماخوذ ضرور ہیں مگر اقبال نے انھیں اس خوبی سے اپنالیا کہ وہ اقبال ہی کی طبع زاد لگتی ہیں اگر اقبال نے خود نشان دہی نہ کی ہوتی تو مماثلت ڈھونڈنا مشکل ہوجاتا۔یہ اقبال کی دیانت علمی ہے کہ انھوں اپنے ماخذ کا پتہ بتادیا مگر کہیں کہیں انھوں نے انگریزی نظم کا پورا حلیہ اسلامی بناڈالا، جیسے میٹلڈا بیتھم Metilda Betham کی نظم A child,s Hymn سے اٹھاے ہوئے خیال کو اردو روپ دیا۔

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدا یا میری
دور دنیا کا مرے دم سے اندھیرا ہوجائے
ہر جگہ میرے چمکنے سے اجالا ہوجائے
میرے اللہ برائی سے بچانا مجھ کو
نیک جو راہ ہو اس رہ پہ چلانا مجھ کو

یہ دعا تو وہی کرسکتا ہے جو اھدنا الصراط المستقیم کی اہمیت جانتا ہو۔بچوں میں خودی بیدار کرنے والا شاعر اگر کوئی ہے تو وہ علامہ اقبال ہیں۔بچوں کے لئے کہی ہوئی ان کی نظمیں مثال میں پیش کی جاسکتی ہیں۔

جاوید سے خطاب کرتے ہوئے بھی اقبال نے اسی خودی کا درس دیا ہے:

دیار عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر
خدا اگر دل فطرت شناس دے تجھ کو
سکوت لالہ وگل سے کلام پیدا کر
اٹھا نہ شیشہ گران فرنگ کے احساں
سفال ہند سے مینا و جام پیدا کر
مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

اسلوب کے تعین میں چار چیزیں اہم رول ادا کرتی ہے
[۱] تخیل [۲] انتخاب موضوع [۳] لفظیات [۴] رویہ Treatment علامہ اقبال کی کوئی نظم یا قطعات یا غزل کا کوئی شعر لے لیجئے اسلوب کے یہ عناصر پورے فنی رچاؤ کے ساتھ اقبال کے قلم سے نکلے ہیں۔

اقبال نے مسدس کو وقار بخشا تو ہمالہ سے لے کر شکوہ جواب شکوہ تک اسے سرخ رو کر ڈالا ورنہ انیسؔ و دبیرؔ کے علاوہ انیسیوں دبیریوں نے اس ہئیت کو رونے رلانے کا آلہ بنا کر رکھ دیا تھا۔ مثنوی میں من گھڑت قصے رومان پسند طبیعتوں کی تفریح کے سامان کے طور پر پیش کیے جاتے تھے اقبال نے ساقی نامہ لکھ کر فلسفۂ خودی سمجھایا نظموں کے نام پر جوش ''کیا گل بدنی گل بدنی گل بدنی ہے'' کہہ کے بدن کے پیچ وخم میں گرفتار تھے تو اخترؔ شیرانی خیالی عذرا وسلمی کی زلفوں میں منہ چھپائے تھے یا حفیظ جالندھری ''ابھی تو میں جوان ہوں'' کی خوش فہمی میں مبتلا تھے یا پھر فیض دامن چھڑاتے ہوئے فرماتے تھے ''مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ'' یا اک اور ترقی پسند شاعر صاحب ہاتھ پکڑ کر کہتے تھے ''اٹھ مری جان مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے'' یا ادھر ن م راشد دعوت دے رہے تھے ''آ مری ہم

رقص مجھ کو تھام لے'' فکر ہر کس بقدر ہمت اوست ۔ اپنے اپنے ماحول کی نمائندگی کرنے والے ان شاعروں کے بالمقابل علامہ اقبال کی فکر عالمی صداقتوں سے آنکھ ملاتی تھی چنانچہ اقبال نے مسجد قرطبہ، ذوق وشوق جیسی بے شمار نظموں کے ذریعے بتایا کہ نظم کسے کہتے ہیں:

اقبال کی سفارش پر دکن میں قدم رکھنے والا جوش خود کو اقبال کا ہم پلہ سمجھنے کی خوش فہمی میں مبتلا تھا جسے ۔

ٹھٹھری ہوئی ساغر میں نظر آتی ہے صہبا رضی اللہ تعالیٰ عنہا

اقبال نے بابا طاہر عریاں کی اتباع میں رباعیات کے نام پر قطعات کے فارسی و اردو میں ڈھیر لگا دیے اور مرد مومن کی صفات بتائیں: جیسے لالۂ طور [پیام مشرق] میں اقبال نے کہا:

میا را بزم بر ساحل کہ آں جا
نوائے زندگانی نرم خیز ست
بدریا غلط و باموجش در آویز
حیاتِ جاوداں اندر ستیز ست

رؤف خیر کا منظوم ترجمہ ملاحظہ فرمائیے:

سجا محفل نہ ساحل پر کہ اس جا
نوائے زندگانی ہے سہک رو
اتر دریا میں لے موجوں سے لوہا
حیاتِ جاوداں ہے یہ تگ ودو

اقبال کہتے ہیں:

تو می گوئی کہ آدم خاک زاد ست
اسیر عالم کون وفسا د ست
ولے فطرت ز اعجازے کہ دارد
بنائے بحر بر جولیش نہاد ست

رؤف خیر نے اس قطعے کے ترجمے میں اپنا ہنر دکھایا ہے:

تو خود کہتا ہے خا کی ہے یہ آدم
اسیرِ یک جہا ن خیر و شر نا
مگر فطرت کے اپنے معجزے سے
سمند ر کی ہوا بنیا د جھر نا

اردو میں بھی بے شمار قطعات میں اقبال نے مردمومن کو غیرت دلائی ہے:

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے
وہ دل وہ آرزو باقی نہیں ہے
نما ز و روزہ و قربانی و حج
یہ سب باقی ہے تو باقی نہیں ہے

غرض کوئی صنف سخن ہو اور کوئی فارم ہیئت ہو اقبال نے زندہ رہ جانے والا اسلوب اختیار کر کے زندہ رہ جانے والی فکر پیش کی اسی لئے ان کی فضلیت تمام شاعروں پر مسلمہ ہے۔ اقبال سے صرف نظر کوئی بے ادب ہی کرسکتا ہے۔

''اقبال کی خامیاں'' تلاش کرنے والا لبھو رام جوش اپنی خوبیوں کے ساتھ مر گیا مگر اقبال زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔

علامہ اقبال کے فضائل میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ کئی زبانیں جانتے تھے۔ اردو، فارسی، پنجابی، سنسکرت، ہندی، جرمن انگلش وغیرہ۔

ان کا تحقیقی مقالہ Metaphysics of Persia ایرانی مابعدالطبعیات پر روشنی ڈالتا ہے علامہ کے خطبات پر مشتمل فکر Reconstruction of Religious thought in Islam اس میں شک نہیں تشکیل الہیاتِ جدید کی بنیاد نہ بن سکی۔ جیسا کہ ہم نے مضمون کے ابتدا ہی میں عرض کر دیا ہے کہ شخصیت و اسلوب کا گراف ضروری نہیں کہ اونچا ہی اٹھتا جائے وہ نیچے بھی آسکتا ہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے فرمایا کہ کاش

اقبال نے خطبات پر مشتمل اپنی کتاب Reconstruction of Religious thought in Islam نہ لکھی ہوتی۔ مگر کچھ ایسے تعقل پسند بھی ہیں جنھوں نے اس فکر کی پذیرائی کی۔

داغ، امیر مینائی، حسرت موہانی جیسے ہم عصر آدھے دھڑ کی عاشقانہ و فاسقانہ شاعری میں بے خود تھے فانی فرما رہے تھے ''کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ''۔ایسے میں اگر غزل کو فکر و فلسفہ اور خودی سے کسی نے آشنا کیا تو وہ علامہ اقبال تھے جن کی غزل محض لغوی معنوں کی اسیر ہو کر نہیں رہ گئی تھی۔

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

گوئٹے کی مغربی لے کے بالمقام ''پیام مشرق'' پیش کرنے والے اقبال نے دانتے کی طربیہء خداوندی [Divine comedy] کے جواب میں ''جاوید نامہ'' جیسی بڑی لکیر کھینچ کر دکھادی۔

فارسی اور اردو ادب میں کسی کی ولادت یا وفات یا کسی اہم واقعے یا اہم عمارت کی تعمیر کے لیے حروف ابجد سے استفادہ کر کے قطعہ تاریخ کہنے کا رواج عام ہے۔تاریخ نکالنا ایک کمال ہے اور یہ کمال بہت کم شاعروں کو نصیب ہے۔علامہ اقبال کی فضیلت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ انھوں نے بعض اہم واقعات کی دل چسپ تاریخیں بھی نکالی ہیں اس طرح بھی اپنے آپ کو منوا کر دکھایا ہے۔ یہ ایک بہت مشکل فن ہے۔اقبال نے یہ مشکل میدان بھی آسانی سے سر کیا ہے۔

''حریت اسلام سر حادثۂ کربلا'' [رموز بے خودی] میں اقبال نے حضرت حسینؓ کے جاں نثاروں کی تعداد دکھاتے ہوئے ایک شعر کہا ہے:

دشمناں چوں ریگ صحرا لاتعد

دوستان او بہ یزداں ہم عدد

یعنی حضرت حسینؓ کے دشمن تو ریت کے مانند لاتعداد تھے مگر ان کے دوست ''یزداں'' کے ہم عدد تھے۔ ابجد کے قاعدے کے مطابق ''یزداں'' کے اعداد نکلتے ہیں بہتر اور کہا جاتا ہے کہ حضرت حسینؓ کے ساتھ جملہ افراد بہتر ہی تھے۔

ٹیپو سلطان شہید کے مزار پر جب اقبال نے حاضری دی تو فارسی میں پانچ اشعار پر مشتمل ایک نظم کہی اور عنوان ہی ایسا لگایا جس سے ٹیپو کی شہادت کی تاریخ نکلتی ہے ''شمشیر گم شد''۔ جس سے ۱۲۱۴ھ تاریخ نکلتی ہے جو مطابق 1799ء ہے اس نظم کے آخری شعر میں اقبال نے مرد مومن کو زندگی و موت کا فلسفہ سمجھا دیا

در جہاں نتواں اگر مردانہ زیست

ہم چو مرداں جاں سپردن زندگیست

ناچیز رؤف خیر نے جو اس شعر کا ترجمہ کیا ہے وہ بھی ملاخط فرمایئے

جی نہیں سکتا جہاں مردانہ وار

مر تو سکتا ہے وہاں مردانہ وار

اپنے استاد داغ دہلوی کی وفات پر اقبال نے بڑی ذہانت سے کام لیتے ہوئے ان کے نام ہی سے تاریخ نکالی یعنی ''نواب میرزا داغ''۔ جس کے اعداد نکلتے ہیں ۱۳۲۲ھ

چل بسا داغ آہ میت اس کی زیب دوش ہے

آخری شاعر جہان آباد کا خاموش ہے

اقبال کو امیر مینائی سے بھی بڑی عقیدت تھی وہ انگریزی میں ان پر جامع مقالہ لکھنے والے تھے مگر لکھ نہ پائے مگر ان کے مرنے پر قرآن کے سورۂ شعراء کی آیت کے ایک ٹکڑے سے تاریخ نکالی:

''لسان صدق فی الآخرین''........جس سے امیر مینائی کی تاریخ وفات ۱۳۱۸ھ برآمد ہوتی ہے۔علامہ کے قریبی دوست میاں شاہ دین ہمایوں علامہ فصیح کہلاتے تھے۔ان کے انتقال پر اقبال نے بڑی دل چسپ تاریخ نکال کر اپنی ذہانت کا ثبوت دیا

در گلستانِ دہر ہمایونِ نکتہ سنج
آمد مثال شبنم و چوں بوئے گل رمید
می جست عندلیب خوش آہنگ سال فوت
علامہ ء فصیح زِ ہر چار سو شنید

''علامہ فصیح'' کے اعداد میں [۳۳۴] انھیں چار سے ضرب دیں تو تاریخ ۱۳۳۶ھ برآمد ہوتی ہے جو میاں شاہ دین ہمایوں کی تاریخ وفات ہے۔

اپنی تیسری بیوی مختار بیگم کی تاریخ وفات ''بشہادت رسید و منزل کرد'' سے ۱۳۴۳ھ نکالی اور والدہ جاوید سردار بیگم کی تاریخ وفات ۱۳۵۴ھ ''سرمۂ مازاغ'' سے نکالی اس سلسلے میں ہمارا ایک مضمون اقبال اور مادۂ تاریخ اسی کتاب میں ملاحظہ فرمایئے۔

فضائل اقبال کے سلسلے میں ایک حکایت بھی دلچسپ ہے ۔ماہ نامہ ''الحمرا'' لاہور کے جولائی ۲۰۱۵ء کے شمارے میں علامہ اقبال کے خادم علی بخش کی کہانی اس کے لے پالک بیٹے کی زبانی شائع ہوتی ہے:

''۱۹۱۹ء کا واقعہ ہے کہ ایک آدھی رات کو علامہ اقبال نے مجھے آواز دی۔میں ان کے کمرے میں گیا تو علامہ اقبال زمین پر دوزانو بیٹھے ہوئے ہیں اور سفید ڈاڑھی والے ایک بزرگ ان کی چارپائی پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ مجھے دیکھ کر علامہ اقبال نے کہا کہ ایک جگ لے کر جاؤ اور ٹھنڈی لسی کے تین گلاس کے برابر لسی لے کر آؤ۔رات کے تقریباً دو بجے ہوں گے۔میں نے عرض کی کہ جناب اس وقت تو تمام دکانیں بند ہو چکی ہوں گی اور اتنی سردی میں ٹھنڈی لسی کہاں سے ملے گی۔تو آپ نے فرمایا تم جاؤ

کہیں نہ کہیں سے تمھیں لسی مل جائے گی ۔ جب باہر نکلا تو دور چوک میں ایک دوکان پر روشنی نظر آئی ۔ وہ دوکان دودھ والے کی تھی ۔ میں وہاں پہنچا تو مجھے ایسا لگا کہ وہ دوکاندار میرا ہی انتظار کر رہا تھا۔ اس نے میرے پہنچنے سے پہلے ہی لسی تیار کی ہوئی تھی ۔ جاتے ہی میرے جگ کو لسی سے بھر دیا۔ میں نے دوکاندار سے پیسوں کا پوچھا تو انھوں نے کہا کہ جاؤ میاں ۔ اقبال سے ہمارا حساب چلتا رہتا ہے ۔ جوں ہی میں لسی لے کر واپس گھر کی طرف مڑا تو اس نے اپنی دوکان بند کر دی ۔

گھر پہنچ کر جب کمرے میں داخل ہوا تو علامہ اقبال نے فرمایا کہ یہ جگ اور گلاس مجھے دو۔ انھوں نے ایک گلاس بھر کر ان بزرگ کو دیا پھر دوسرا دیا اور تیسرا گلاس بزرگ نے علامہ اقبال سے کہا کہ تم پی لو۔ مجھے علامہ اقبال نے کہا کہ اپنے کمرے میں جاؤ۔ اگر ضرورت ہوگی تو تمھیں بلالوں گا۔ میں باہر برآمدہ میں جا کر بیٹھ گیا۔ میں نے ان کی باتیں سننے کی کوشش کی مگر میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ پھر وہ بزرگ کمرے سے نکلے ۔ اقبال انھیں دروازے تک چھوڑنے گئے ۔ کچھ دنوں کے بعد میں علامہ اقبال کے ہاتھ پاؤں دبا رہا تھا تو میں نے جرأت کر کے علامہ اقبال سے پوچھا کہ وہ کون شخص تھا جس کے لیے آپ نے لسی منگوائی تھی ۔ میں نے ان بزرگ کو دروازہ کھولتے نہیں دیکھا۔ وہ کیسے باہر گئے اور کہاں چلے گئے اور جس لسی کی دوکان سے میں نے لسی لی تھی وہ دوکان میں نے پہلے وہاں کبھی نہیں دیکھی اور نہ ہی بعد میں وہ نظر آئی ۔ مجھے آپ براہ مہربانی بتائیں کہ یہ کیا ماجرا ہے اور وہ بزرگ جو آپ کو ملنے آپ کے کمرے میں آئے وہ کون تھے۔ علامہ اقبال نے مجھ سے وعدہ لیا کہ میری زندگی میں یہ بات کسی کو نہ بتاؤ گے ۔ چنانچہ میں نے علامہ اقبال کی زندگی میں یہ بات کسی کو نہیں بتائی ۔ علامہ اقبال نے جواب فرمایا کہ وہ بزرگ جو میرے پاس آئے تھے وہ خواجہ معین الدین چشتی تھے اور جو لسی کی دوکان کھول کر بیٹھے تھے وہ علی ہجویری داتا گنج بخش تھے"۔

اس دلچسپ حکایت کے تین راوی ہیں پہلے راوی مہر رؤف عزیز جنھوں نے مانچسٹر سے پاکستان پہنچ کر لائل پور کا سفر کیا جہاں انھوں نے دوسرے راوی چوہدری اقبال سے ملاقات کی جو علامہ اقبال کے خادم علی بخش کے لے پالک بیٹے ہیں اور تیسرے راوی علی بخش ہیں جن کی زبانی یہ کہانی چوہدری اقبال سے ہوتی ہوئی مہر رؤف عزیز کے قلم سے قارئین الحمرا تک پہنچی۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ علامہ اقبال نے اس کہانی کو اپنے جیتے جی منظرِ عام پر لانے سے روکا کیوں؟ یہ تو ان کے لے ایک اعزاز کی بات تھی کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اجمیر سے لاہور کا سفر کیا۔ ۱۹۱۹ء میں کڑاکے کی سردی میں آدھی رات کو علامہ اقبال سے ملاقات کی اور ان کی پیش کردہ لسی نوش کی جو رات دو بجے علی ہجویری داتا گنج بخشؒ کی دوکان سے اپنے خادم کے ہاتھ منگوائی گئی تھی۔اولیاء اللہ کا معاملہ ہے وہ لسی پینے کے لیے فاصلے اور موسم کی پروا کیے بغیر کہیں بھی جاسکتے ہیں اور پھر پنجاب کی لسی یوں بھی مشہور ہے اور اگر وہ صاحبِ کشف المحجوب کی دوکان سے آئے تو اس کے ذائقے کے کیا کہنے،علامہ ارشد القادری کی حیات میں یہ کہانی منظرِ عام پر آئی ہوتی تو غالباً ایک اور ''زلزلہ'' رونما ہوتا اور پھر ''زلزلہ در زلزلہ'' کا سلسلہ چل پڑتا۔

علامہ اقبال ۱۹۱۹ء کے آس پاس تک تصوف کے خلاف نوٹس جمع کر کے ایک کتاب لکھنے والے تھے۔ بعد میں کراچی کے پروفیسر صابر کلوروی نے تاریخ تصوف کے نام سے ۱۹۸۵ء کی اہم دریافت کے طور پر یہ تمام نوٹس کتابی شکل میں شائع کر دیئے۔

ڈاکٹر جاوید اقبال نے پروفیسر صابر کلوروی کے نام اپنے ایک خط مورخہ ۳۰، جنوری، ۱۹۸۵ء کو لکھا اقتباس:

''ویسے آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اس نامکمل کتاب ''تاریخ تصوف'' کے ابواب جو علامہ اقبال کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں وہ اس وقت اقبال میوزیم کی تحویل میں ہیں۔کم از کم میں نے انھیں سرسری طور پر وہیں دیکھا ہے''۔

سید فصیح اللہ کاظمی کے نام ایک خط مورخہ ۱۴ر جولائی ۱۹۱۹ء کو علامہ اقبال لکھتے ہیں

''تصوف کے متعلق میں خود لکھ رہا ہوں ۔ میرے نزدیک حافظ کی شاعری نے بالخصوص اور عجمی شاعری نے بالعموم مسلمانوں کی سیرت اور عام زندگی پر نہایت مذموم اثر کیا ہے ۔ اسی واسطے میں نے ان کے خلاف لکھا ہے ۔ مجھے امید تھی کہ لوگ مخالفت کریں گے اور گالیاں دیں گے لیکن میرا ایمان گوارا نہیں کرتا کہ حق بات نہ کہوں ۔ شاعری میرے لیے ذریعۂ معاش نہیں کہ میں لوگوں کے اعتراضات سے ڈروں ....'' [مشمولہ خطوط اقبال مرتبہ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صفحہ ۱۲] ۔۔۔ بحوالہ ''تاریخ تصوف'' مکتبہ الحسنات دہلی ایڈیشن ۱۹۸۹ء

مگر یہ بھی سچ ہے کہ علامہ اقبال نے مصلحت سے کام لیتے ہوئے چونتیس ۳۴ اشعار کا وہ بند نکال دیا جس میں حافظ شیرازی کے زہریلے اثرات سے قوم کو خبردار کیا گیا تھا اور اس کے مسلک کو مسلک گوسفندی قرار دیا گیا تھا البتہ وہ بند شامل رکھا جس میں افلاطون کو نشانہ بنایا تھا۔

راہب دیرینہ افلاطون حکیم   از گروہ گوسفندان قدیم

حافظ شیرازی کے معاملے میں خواجہ حسن نظامی نے اقبال کا پیچھا کیا اور مسئلہ وحدت الوجود کو قرآن سے ثابت کرنے کی بھی کوشش کی تھی لیکن اکبرالہ آبادی اور شاہ سلیمان پھلواری نے انھیں ایسا کرنے سے باز رکھا۔ اقبال اسی زمانے میں یہ اعتراف بھی کرتے نظر آتے ہیں۔

''مجھے اس امر کا اعتراف کرنے میں کوئی شرم نہیں کہ میں ایک عرصے تک ایسے عقائد و مسائل کا قائل رہا جو بعض صوفیہ کے ساتھ خاص ہیں اور جو بعد میں قرآن شریف میں تدبر کرنے سے قطعاً غیر اسلامی ثابت ہوئے مثلاً شیخ محی الدین عربی کا مسئلہ قدم ارواح کملاء وحدت الوجود یا مسئلہ تنزلات ستہ ۔۔۔ مذکورہ بالا تینوں مسائل میرے نزدیک مذہب اسلام سے کوئی تعلق نہیں رکھتے''۔

(''وکیل'' ۱۵، جنوری ۱۹۱۶ء ۔۔۔ بحوالہ ''تاریخ تصوف'')

بلند بانگ دعوے کرنے والے علامہ اقبال دراصل صلح کل کی روش کے آدمی تھے وہ سب کو خوش کرنے کی پالیسی پر عمل پیرا رہتے تھے تا کہ ان کی مقبولیت ہر مسلک میں قائم رہے۔ بقول خیؔر

بدعتی اور خبیث بھی خوش تھے
ان سے اہل حدیث بھی خوش تھے

اقبال نے حافظ سے متعلق اپنا موقف بدل دیا وہ بحث ومباحثہ، جواب الجواب سلسلوں میں الجھنا نہیں چاہتے تھے۔ اپنے آپ کو تصوف کا مخالف کے بجائے تصوف دوست ''ثابت کرنے کے لیے انھوں نے ''ارواح ثلاثہ'' میں خود کو شامل کرلیا[اس جملے کا لطف وہی لے سکتے ہیں جنھوں نے کتاب ''ارواح ثلاثہ'' پڑھ رکھی ہے] یہاں ارواح ثلاثہ ہیں خواجہ معین الدین چشتی، علی ہجویری داتا گنج بخش اور علامہ اقبال۔ بہر حال علی بخش کی بیان کردہ یہ مذکورہ حکایت فضائل اقبال میں اضافہ کرتی ہے بھلے ہی ماہر اقبالیات ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کو اسے ماننے میں تامل ہو۔



اقبؔال اور ہم

میرا خیال ہے۔اقبال سے پہلے بھی کوئی خدائے سخن نہیں اور اقبؔال کے بعد شاعری کا دعویٰ کرنا ،نبوت کا دعویٰ کرنے کے برابر ہے۔زیادہ سے زیادہ اولیائے غزل اور اوصیائے نظم ہوسکتے ہیں۔

اقبؔال کا پیام ملتِ اسلامیہ کے نام

اقبؔال کا مطلوب نو جوان

اقبؔال کا تصورِ شاہین

اقبؔال کا مردِ کامل

اقبؔال کا فلسفۂ خودی

برصغیر کی صورتِ حال اور اقبؔال

اکیسویں صدی میں فکرِ اقبؔال کی معنویت

یہ تمام موضوعات ایک دوسرے سے تقریباً مربوط ہیں۔ (Inter Linked) اقبال کا مخاطب ملتِ اسلامیہ کا وہ نوجوان ہے جوخودی کا حامل، مردِ کامل اور شاہین کی طرح منفرد ہو۔اقبؔال نے جو کچھ کہا وہ از کار رفتہ نہیں ہوگیا بلکہ برصغیر کی جوصورتِ حال ہے اس کے پیشِ نظر یہ آسانی سے کہا جاسکتا ہے کہ اکیسویں صدی میں بھی فکرِ اقبؔال کی معنویت برقرار ہے۔اقبؔال کا فلسفہ خودی ان کے فکروفن کی بنیاد ہے جس پر پوری عمارتِ سخن تعمیر کی گئی ہے۔جس کی دیوار تا ثریا بھی جائے تو کہیں کوئی کجی محسوس نہ ہوگی۔

شعروادب میں استعارات وکنایات وعلامات ہرزبان ہرادب اور ہر دور میں الگ الگ ہوتی ہیں۔فارسی میں برتا جانے والا اسلوب،عربی اسلوب سے یکسر جداگانہ ہوتا

ہے۔ انگریزی لب و لہجہ اپنی شناخت الگ رکھتا ہے۔ اردو میں مختلف ادوار میں مختلف تحریکات کے زیر اثر مختلف پیرایۂ اظہار اختیار کیا گیا ہے۔ دہلی مکتبِ فکر کے نمائندہ شعراء میرؔ، غالبؔ، مومنؔ وغیرہ رہے ہیں۔ مومن کا بے پناہ شعر جس کی داد غالبؔ نے یوں دی کہ اس کے عوض اپنے سارے دیوان کی پیش کش کی۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

لکھنوی تہذیب وفکر کے نمائندے میر انیس، آتش، امیر مینائی وغیرہ ہیں۔ امیر مینائی کا شعر ہے:

باغباں کلیاں ہوں ہلکے رنگ کی
بھیجنی ہیں ایک کم سن کے لیے

اقبالؔ کو نہ دہلی سے غرض ہے نہ لکھنؤ سے واسطہ۔ پیارے صاحب رشیدؔ داد دیں نہ دیں اقبالؔ کو کچھ فرق نہیں پڑتا۔ وہ بڑے انکسار سے کہہ دیتا ہے کہ وہ زبانِ سخن سے آشنائی کا مدعی نہیں بلکہ حجازی لے میں مست ہے۔ ترقی پسند تو اقبالؔ سے صرفِ نظر کرتے رہے مگر جب اقبالؔ نے کہا:

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

کاخِ امراء کے در و دیوار ہلا دینے والے اقبالؔ کی طرف لا محالہ متوجہ ہونا پڑا مگر جب یہی اقبالؔ کہتے ہیں:

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح قلم تیرے ہیں

تو اقبالؔ کی ترقی دیکھی نہیں جاتی ہے۔ یہ قل اعوذیت لگتی ہے۔

اقبالؔ کی اپنی علائم ان کا شناس نامہ ہو کے رہ گئیں جیسے کافر و مومن، کرگس و

شاہین، ابلیس و جبریل وغیرہ وغیرہ۔

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

''خودی'' اقبالؔ کی ایک خاص اصطلاح ہے جس کی تشریح خود اقبالؔ نے اپنی کتاب ''اسرارِ خودی'' کے دیباچے میں اس طرح کی ہے:

''یہ لفظ اس نظم میں بہ معنی غرور استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ جیسا کہ عام طور پر اردو میں مستعمل ہے۔ اس کا مفہوم احساسِ نفس یا تعینِ ذات ہے۔''

احساسِ نفس دراصل عرفانِ نفس ہے۔ بقول شخصے مَن عَرَفَ نَفسَہ' فَقد عَرَفَ رَبَّہ' جس نے اپنے آپ کو پہچانا اس نے رب کو پہچانا (مخفی مباد کہ یہ کوئی حدیثِ رسول نہیں ہے) تعین ذات بھی درحقیقت خدا کی ذاتِ واحد اور اس کی لامحدود صفات کے ادراک کے ساتھ ساتھ اپنی حیثیت سے آگہی کا نام ہے۔ یہی خودی ہے۔

اقبالؔ نے جگہ جگہ خودی کی تشریح کی ہے۔ بچوں کے لئے نظمیں کہتے ہوئے ایک مکڑا اور مکھی پہاڑ اور گلہری، ہمدردی، گائے اور بکری وغیرہ وغیرہ میں بھی جانوروں کے ذریعے خودی کا درس دیا ہے۔ گلہری کی خودی کسی پہاڑ سے کم نہیں۔ وہ کہتی ہے:

بڑا جہان میں تجھ کو بنا دیا اس نے
مجھے درخت پہ چڑھنا سکھا دیا اس نے

جو تو بڑا ہے تو مجھ سا ہنر دکھا مجھ کو
یہ چھالیہ ہی ذرا توڑ کر دکھا مجھ کو

اقبآل کے یہاں خودی ایک حرکی تصور ہے۔ اقبآل خانقاہی نظام، ملا وصوفی کی گوشہ نشینی اور تصوف کی بھول بھلیوں سے نالاں تھے:

قم باذن اللہ کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے
خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن

اقبآل ایک جگہ کہتے ہیں:

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
ملّا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور
اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غم ناک
نہ زندگی، نہ محبت، نہ معرفت نہ نگاہ

عام طور پر اہل تصوف بے جہد گیان دھیان اور یک طرفہ راہبانہ نفس کشی کی تعلیم وترغیب دیتے ہیں۔ اس کے برخلاف اقبآل مجاہدانہ طرزِ حیات کے قائل اور مبلغ تھے۔ وہ تو مردمومن کو یہ مشورہ دیتے ہیں:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اپنی نظم ''ساقی نامہ'' میں انھوں نے خودی کی زینہ بہ زینہ تشریح کی:

یہ موجِ نفس کیا ہے تلوار ہے — خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے
خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات — خودی کیا ہے، بیداریِ کائنات
خودی جلوہ بدمست وخلوت پسند — سمندر ہے اک بوند پانی میں بند

غالب کے خیال میں عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا مگر اقبآل کوزے میں سمندر کو بند کرنے کے قائل ہیں بھلے ہی امیر خسرؔو کہتے ہوں:

من تو شدم تو من شدی، من جاں شدم تو تن شدی
تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

ہمیشہ ہمیشہ باقی رہنے والے خدا میں انسان کی فانی ہستی بھلا کیسے ضم ہو سکتی ہے۔ دونوں کا ملاپ ہی ناممکن ہے۔ خودی کوئی بیرونی شئے نہیں ہے بلکہ مردِ مومن کے اندرون ہی سے عبارت ہے:

اندھیرے اجالے میں ہے تابناک — من وتو میں پیدا من وتو سے پاک
ازل اس کے پیچھے ابد سامنے — نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے
خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے — فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے

اقبالؔ نے ہمیشہ خودی کی تہذیب و تربیت پر زور دیا ہے۔ وہ خودی کو مثبت راستوں پر گامزن دیکھنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ اگر خودی کی صحیح طور پر پرورش ونگہداشت ہو تو وہ خودی کارآمد ٹھہرتی ہے:

خودی کی پرورش وتربیت پہ ہے موقوف
کہ مشتِ خاک میں پیدا ہو آتش ہمہ سوز

یہی ہے سرِّ کلیمی ہر اک زمانے میں
ہوائے دشت وشعیب وشبانیِ شب و روز

اسی منزل پر آ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کہنا پڑا تھا:

ربِّ انّی لما اَنزَلتَ اِلَیّہ من خَیرٍ فقیر

یعنی اے مرے رب تیری طرف سے جو بھی عطا ہو اس کا محتاج ہوں۔ اگر خودی بھٹک جائے تو پھر مسولینی اور ہٹلر جنم لیتے ہیں:

تہذیب کا کمال، شرافت کا ہے زوال
غارت گری جہاں میں ہے اقوام کی معاش
ہر گرگ کو ہے برّہ معصوم کی تلاش

بقول اقبال:

''خودی خواہ مسولینی کی ہو خواہ ہٹلر کی، قانونِ الٰہی کی پابندی ہو جائے تو مسلمان ہو جاتی ہے، بہرحال حدودِ خودی کے تعین کا نام شریعت ہے۔''

حضورِ رسالت مآب میں اقبالؔ شکوہ کرتے ہیں:

حضور دہر میں آسودگی نہیں ملتی
تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی

ابوالعلا معری کی زبانی ایک بھونے ہوئے تیتر کے حوالے سے اقبالؔ زندگی کا فلسفہ سمجھاتے ہیں:

افسوس صد افسوس کہ شاہیں نہ بنا تو
دیکھے نہ تری آنکھ نے فطرت کے اشارات
تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

جاوید اگرچہ اقبالؔ کے فرزند کا نام ہے مگر یہ نام نئی نسل کی نمائندگی کی علامت ہے۔ وہ بظاہر جاوید سے خطاب کرتے ہیں لیکن ان کا مخاطب ملتِ اسلامیہ کا ہر نوجوان ہے۔ جس میں وہ مردِ کامل کی صفات دیکھنا چاہتے ہیں۔ خودی کا فلسفہ سمجھاتے ہوئے کہتے ہیں:

خودی کے ساز میں ہے عمر جاوداں کا سراغ
خودی کے سوز سے روشن ہے امتوں کا چراغ
ہوئی نہ زاغ میں پیدا بلند پروازی
خراب کر گئی شاہیں بچے کو صحبتِ زاغ
حیا نہیں ہے زمانے کی آنکھ میں باقی
خدا کرے کہ جوانی تری رہے بے داغ
ٹھہر سکا نہ کسی خانقاہ میں اقبالؔ
کہ ہے ظریف و خوش اندیشہ و شگفتہ دماغ

یاد رہے یہاں ظریف، خوش طبع کے معنوں کے ساتھ ساتھ زیرک اور عقل مند کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے۔ کم ظرف و کم سواد زمانے میں مرد مومن کو اپنی جوانی بے داغ رکھنے کے لیے بڑے حوصلے کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے۔ ہمارے سامنے حضرت یوسف علیہ السلام کی جوانی کی مثال بھی ہے۔ بال جبریل میں اک اور معرکتہ الآرا نظم جاوید کے نام بھی دراصل نئی نسل کے نام ہے:

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر
خدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھ کو
سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر
اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں
سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر
میں شاخِ تاک ہوں میری غزل ہے میرا ثمر
مرے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر
مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

اقبال نے شاہین کی علامت میں اردو ادب کو ایک نئی فکر سے آشنا کیا۔ اس ذائقے سے اردو ادب نابلد تھا۔ کرگس کے بالمقابل شاہین کی تخلیق اقبال کی مومنانہ فکر کی غماز ہے۔ اسے انھوں نے ایک مثالی پرندہ بنا کر ایک مثالی کردار کا نمائندہ بنا دیا ہے۔ شاہین میں ایسی خوبیوں کی نشاندہی کر دی ہے جو دراصل مرد مومن کی صفات ہیں۔ شاہین کی خصوصیات گناتے ہوئے وہ حقیقت میں مرد کامل کا خاکہ کھینچتے ہیں۔ بال جبریل میں اک نظم بعنوانِ ''شاہین'' درج ہے:

حمام و کبوتر کا بھوکا نہیں میں — کہ ہے زندگی باز کی زاہدانہ
جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا — لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ
پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں — کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ

''یہی کار آشیاں بندی'' آدمی کو مٹی کی محبت میں گرفتار کر کے چھوڑتی ہے۔ حالانکہ اس کی منزل آسماں ہے۔ اقبالؔ اس خاکی پیکر کو بہت بلند دیکھنا چاہتے ہیں:

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارامہِ کامل نہ بن جائے

اقبالؔ نے شاہین کے حوالے سے مردِ مومن کو زمین میں الجھ کر رہ جانے سے روکا ہے:

گزراوقات کر لیتا ہے یہ کوہ و بیاباں میں
کہ شاہیں کے لئے ذلت ہے کار آشیاں بندی

اقبالؔ نے مغربی فلسفے کو بھی مشرف بہ اسلام کر کے چھوڑا ہے:

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیل کو آدابِ فرزندی؟

مختصر یہ کہ اقبالؔ حرکت و عمل میں یقین رکھتے تھے اسی کی دعوت دیتے تھے۔ ان کے تمام کلام میں یہی فلسفہ جگہ جگہ بولتا دکھائی دیتا ہے۔ ملت اسلامیہ کا نوجوان اقبالؔ کا مطلوب ہے اس سے اقبالؔ طالب ہوتے ہیں مگر سلطان ٹیپو کی وصیت کے حوالے سے:

تو رہ نوردِ شوق ہے منزل نہ کر قبول
لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول

اے جوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز
ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول

کھویا نہ جا صنم کدۂ کائنات میں
محفل گداز، گرمیِ محفل نہ کر قبول

صبحِ ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے
جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول

باطل دوئی پسند ہے حق لا شریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

ہر بہادر شخص علامہ اقبالؔ کا ہیرو ہے۔ سری رنگا پٹنم میں آسودہ شیرِ میسور ٹیپو سلطان کے مزار پر حاضری دینے کے بعد اقبالؔ نے پانچ اشعار پر مشتمل ایک فارسی نظم بعنوان ''شمشیر گم شد'' کہی جس سے ٹیپو سلطان کی تاریخ شہادت ۱۲۱۴ھ مطابق ۱۷۹۹ء برآمد ہوتی ہے۔ یہ فارسی نظم اقبالؔ کے کسی بھی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔

پہلی بار اس نظم کا انکشاف علامہ اقبالؔ کے فرزند ارجمند جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبالؔ نے اپنی خودنوشت سوانح عمری ''اپنا گریباں چاک'' میں کیا۔ (ملاحظہ ہو سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور کا مطبوعہ اضافہ شدہ ایڈیشن مارچ ۲۰۰۶ء) راقم الحروف نے اقبالؔ کی اس فارسی نظم کا منظوم اردو ترجمہ کیا ہے۔ جو فارسی متن کے ساتھ پیش ہے۔

شمشیر گم شد (اقبال)

آتشے در دلِ دگر بر کردہ ام ... داستانے از دکن آوردہ ام
در کنارم خنجرِ آئینہ فام ... می کشم او را بتدریج از نیام
نکتۂ گویم زِ سلطانِ شہید ... زاں کہ ترسم تلخ گردد روزِ عید
پیشتر رفتم کہ بوسم خاکِ او ... تا شنیدم از مزارِ پاکِ او

در جہاں نتواں اگر مردانہ زیست
ہم چو مرداں جاں سپردن زندگیست

(رؤف خیر)

میرے دل میں اک حرارت بھر گئی
یہ دکن کی داستاں کیا کر گئی
کانچ سا خنجر مرے پہلو میں ہے
دھیرے دھیرے میان سے کھینچوں اسے
مجھ سے کہتے تھے یہ سلطانِ شہید
ڈر رہے سن کر تلخ ہوگی تیری عید
مس ہوئے جب لب مرے اس خاک سے
اک ندا آئی مزارِ پاک سے
جی نہیں سکتا جہاں مردانہ وار
مر تو سکتا ہے وہاں مردانہ وار

ٹیپو سلطان کی زبانی علامہ اقبالؔ نے مردِ مومن کو زندگی و موت کا فلسفہ سمجھا دیا ہے۔



بہ فیضِ اقبال

گوئٹے کا دیوان مغرب West Osticher Divan 1819ء میں شائع ہوا تھا جس کے جواب میں علامہ اقبآل کا ''پیامِ مشرق'' تقریباً ایک سو سال بعد عالم وجود میں آیا۔ اپنے مجموعے کے سرنامے کے طور پر اقبآل نے ''وللہ المشرق و المغرب'' لکھ کر گویا یہ ثابت کیا کہ مشرق و مغرب کی فرماں روائی الہ واحد ہی کا حق ہے جو زمان و مکان کی قید سے ماورا ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ کہیں گوئٹے کی وجہ سے اقبال زیر بحث ہیں تو کہیں اقبال کی وجہ سے گوئٹے کے فکر و فن کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔ فلسفہ، تنقید ، شعریات اور تہذیب کا یہ ایک زندہ موضوع بن گیا ہے۔ ڈاکٹر اکرام چغتائی نے اس موضوع پر دنیا بھر کی مختلف زبانوں میں شائع ہونے والی لگ بھگ تین سو کتابوں کی فہرست شائع کی ہے۔

بیشتر شعراء وادباء نے نظم ونثر میں اقبال کے فارسی کلام کا ترجمہ کیا ہے۔ فیض احمد فیض نے ''پیام مشرق'' میں شامل ایک سو تر سٹھ قطعات ''لالہء طور'' میں سے صرف چند قطعات کا منظوم اردو ترجمہ کیا ہے۔ انھوں نے چند ایسے ہی قطعات کا انتخاب کیا ہے جو ان کی ''فکر'' سے قریب انھیں لگے۔ اقبال کو ترقی پسند بڑا شاعر ماننے پر مجبور ضرور ہوئے مگر کلی طور پر ہم نوائی پر آمادہ نہ ہو سکے۔ مگر فیض نے علامہ اقبال کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے جن چند قطعات کا منظوم اردو ترجمہ کیا ہے وہ ان کی کشادہ دلی کا مظہر ہے۔

فیض نے بعض قطعات کا ترجمہ کرتے ہوئے اس بحر کا التزام برقرار نہیں رکھا جس بحر میں اقبال کے قطعات ہیں جیسے ''لالہ ءطور'' کا باسٹھواں قطعہ ہے:

مگو از مدعائے زندگانی ترا بر شیوہ ہائے او نگہ نیست
من از ذوقِ سفر آنگونہ مستم کہ منزل پیش من جز سنگِ رہ نیست

فیضؔ نے اس کا منظوم ترجمہ یوں کیا ہے:

نہ کہہ کہ مقصد و مقصودِ زندگی کیا ہے کہ اس کی رمز و ادا پر تری نگاہ نہیں
وہ مستِ ذوقِ سفر ہوں، مرے لیے منزل ملے جو راہ میں، جُز ایک سنگِ راہ نہیں

اپنی طرف سے چند الفاظ کا اضافہ کر کے دراصل فیضؔ نے اقبال کی پوری فکر کو سمیٹنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ناچیز رؤف خیر نے اپنی سی کوشش کی ہے کہ منظوم ترجمے میں علامہ اقبال کی استعمال کردہ بحر بھی قائم رہے اور ترجمے کا حق بھی ادا ہو۔

(ملاحظہ ہو ''قنطار'')

نہ کہہ کچھ مدعائے زندگی پر اداؤں سے تو اس کی بے خبر ہے
میں ہوں ذوقِ سفر میں مست اتنا مجھے منزل بھی سنگِ رہگزر ہے

اقبال کے مندرجہ ذیل قطعے کا ترجمہ فیض نے اس قدر رواں کیا ہے کہ بے ساختہ داد نکل جاتی ہے

مپرس از عشق و از نیرنگی عشق بہر رنگے کہ خواہی سر بر آرد
درونِ سینہ بیش از نقطہ ء نیست چو آید بر زباں پایاں ندارد

فیض کا ترجمہ ملاحظہ فرمایئے:

عجب ہے عشق اور نیرنگی عشق یہ سو سو رنگ میں جلوہ دکھائے
اگر دل میں رہے تو ایک نقطہ ہے بے پایاں اگر کہنے میں آئے

ناچیز رؤف خیر کے ترجمے پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے:

نہ پوچھ اب عشق کا ہے کیا کرشمہ　　کہ ہے ہر رنگ میں وہ جلوہ فرما
نہیں سینے میں نقطے سے زیادہ　　زباں پر آئے تو ہو بے احاطہ

علامہ اقبال کے ایک قطعے کا فیض نے بڑا دل نشیں ترجمہ کیا ہے:

مشوائے غنچہ ء نورستہ دل گیر　　ازیں بستاں سرا دیگر چہ خواہی
لبِ جو، بزم گل، مرغ چمن سیر　　صبا، شبنم، نوائے صبح گاہی

فیض کہتے ہیں:

نہ ہو دل گیر اے نورستہ غنچے　　تجھے اس گلستاں میں چاہیئے کیا
لب جو، سبزہ وبزمِ عنادل　　صبا، شبنم، ترانہ صبح گل کا

اب ذرا ایک نظر رؤف خیر کے ترجمے پر بھی فرمایئے:

نہ ہو غمگین اتنا تازہ غنچے　　تجھے کیا چاہیئے اب اس چمن سے
لب جو، بزم گل، طائر چہکتے　　صبا، شبنم کہ نغمے صبح دم کے

جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے اقبال کے کسی کسی قطعے کا ترجمہ کرتے ہوئے فیض نے اقبال کی بحر کا لزوم برقرار نہیں رکھا اور اپنی سہولت سے ان کی ترجمانی کی ہے۔ جیسے اقبال کا قطعہ ہے:

بہ پائے خود مزن زنجیر تقدیر　　تہِ ایں گنبد گرداں رہے ہست
اگر باور نہ داری خیز و دریاب　　کہ چوں پا واکنی جولانگہے ہست

فیض نے شاعرانہ لائسنس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے:

تقدیر کو ہرگز نہ بنا پاؤں کی زنجیر　　یہ گنبد گرداں کوئی زنداں تو نہیں ہے
باور نہیں گر تجھ کو تو اٹھ پاؤں ذرا کھول　　چلنے کے لیے تیرے فقط راہ یہیں ہے

ناچیز نے علامہ اقبال کے پورے ایک سو تر سٹھ قطعات ''لالہء طور'' کا منظوم ترجمہ جو کیا ہے وہ ''قنطار'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے جس کے اب تک تین ایڈیشن نکل چکے ہیں ۔ مذکورہ قطعے کا جو ترجمہ راقم الحروف رؤف خیر نے کیا ہے وہ اس طرح ہے جس میں اقبال کی بحر کی پابندی کی گئی ہے:

کبھی تقدیر کا پابند مت ہو یہاں ہر سمت ہے رستہ ہی رستہ
اگر باور نہ آئے ، دیکھ اٹھ کر کہ پیروں سے ہے جولاں گاہ بستہ

علامہ اقبال کے ''لالہء طور'' کا یہ قطعہ ان کے خاص اسلوب کا نمائندہ ہے

شنیدم در عدم پروانہ می گفت دمے از زندگی تاب وتبم بخش
پریشاں کن سحر خاکسترم را ولیکن سوز و سازِ یک شبم بخش

فیض نے اس کا ترجمہ بھی اپنے دل نشیں اسلوب میں کیا ہے جو ان کی پہچان ہے

یہ پروانہ عدم میں کہہ رہا تھا مجھے تابندگی کا راز دے دے
بکھر جائے سحر کو راکھ میری مگر شب بھر کا سوز و ساز دے دے

رؤف خیر نے ''قنطار'' میں جو اس کا ترجمہ کیا ہے وہ بھی اربابِ نظر کی نذر ہے:

سنا، پروانہ کہتا تھا عدم میں مجھے پل بھر حیات تاب وتب دے
پریشاں کر گجردم خاک میری مگر بھرپور سوز و سازِ شب دے

علامہ اقبال کا فلسفہء خودی اس قطعے میں بڑے سلیقے سے پیش کیا گیا ہے:

ترا یک نکتہء سربستہ گویم اگر درسِ حیات ازمن بگیری
بمیری گر بہ تن جانے نہ داری وگر جانے بہ تن داری نمیری

فیض نے اس کا ترجمہ بھی اسی آب وتاب سے کیا ہے جس کا وہ متقاضی ہے:

بتاؤں میں تمھیں اک نکتہء راز جو سرّ زندگی مجھ سے سنو گے
اگر بے جاں ہے تن تو مردنی ہے اگر تن میں ہے جاں زندہ رہو گے

ناچیز رؤف خیر نے اس قطعے کا ترجمہ کرتے ہوئے اپنا ہنر دکھایا ہے جو پیش ہے:

کہوں اک نکتہء سربستہ تجھ سے سمجھ یہ مجھ سے درسِ زندگانی
بدن بے کار ہے، بے جان ہے گر ہے جاں ،روحِ حیاتِ جاودانی

علامہ اقبال نے ہمیشہ انسان کو ''مردکامل'' کے طور پر دیکھنا پسند کیا ہے۔ان کے خیال میں ایسا ہی مردمومن، مقصد الٰہی ہے:

گدائے جلوہ رفتی برسرِ طور کہ جانِ تو زخود نامحرمے ہست
قدم درجستجوے آدمے زن خدا ہم درتلاشِ آدمے ہست

فیض نے اس کا بڑا خوب صورت ترجمہ کیا ہے کیونکہ ان کے پیش نظر ایسا ہی آدمی ترقی پسند کہلانے کا مستحق بھی تو ہوتا ہے:

تو جلوہ ڈھونڈنے پہنچا سرِطور کہ اپنے سے تجھے نامحرمی ہے
ذرا بڑھ کر تلاشِ آدمی کر خدا کو بھی تلاشِ آدمی ہے

راقم الحروف رؤف خیر نے بھی اس قطعے کا اپنے طور پر بہتر ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ جو اہلِ نظر کی خدمت میں پیش ہے:

گیا ہے طور پر جلوے کا طالب خود اپنی ذات سے ناآگہی ہے
قدم دھر آدمی کی جستجو میں خدا کو خود تلاشِ آدمی ہے

علامہ اقبال کے ایک اور قطعے میں شاعر سے خطاب ہے

زمن با شاعر رنگیں بیاں گوے　　چہ سود ازسوزاگر چوں لالہ سوزی
نہ خود رامی گدازی زاتشِ خویش　　نہ شامِ درد مندے بر فروزی

فیض نے اپنے مخصوص لہجے میں اس کا بڑا اچھا رواں ترجمہ کیا ہے

یہ کہہ دو شاعرِ رنگیں بیاں سے　　عبث ہے تو مثالِ لالہ سوزاں
نہ اس آتش میں تو خود ہی جلا ہے　　نہ روشن اس سے شامِ درد منداں

''قنطار'' میں اس قطعے کا ترجمہ رؤف خیر نے اپنے انداز میں کچھ اس طرح کیا ہے:

کہو یہ شاعرِ رنگیں بیاں سے　　بطرزِ لالہ جلنا بھی ہے جلنا؟
نہ چمکا ناکسی محتاج کی شام　　نہ اپنی آگ میں خود ہی پگھلنا

علامہ اقبال کی فارسی شاعری کے تراجم ہندو پاک میں بہت ہوئے ہیں۔اور ہر فن کار نے اپنی بساط کے مطابق اپنے ترجمے کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش ہے۔تاکہ دیگر تراجم کے سامنے وہ پھیکے نہ پڑ جائیں۔یہی کوشش ناچیز رؤف خیر کی بھی رہی ہے کہ علامہ اقبال کا منشا پوری طرف حرف بہ حرف گرفت میں آجائے اوراس میں اپنی طرف سے کوئی حذف واضافہ ممکنہ حد تک ہونے نہ پائے۔قابل و مشاق مترجمین کے قد و قامت علمی کا اعتراف اپنی جگہ،اور یہ جسارت اپنی جگہ۔ارباب کمال سے داد کا امیدوار ایک مبتدی بھی تو ہوتا ہے ورنہ کہاں اقبال،کہاں فیض اور کہاں رؤف خیر۔!

☆☆☆

کیٹس اور اقبال کے اسلوب کا تقابلی مطالعہ

اسلوب کی تعریف حروف مقطعات کے معنی تلاش کرنے کے برابر ہے۔اسلوب کی تعریف دانشوروں نے اپنے اپنے انداز میں کئی طرح سے کی ہے۔کسی نے کہا:

۱۔ اسلوب ہی شخصیت ہے Style is the person (بفون)

۲۔ کسی نے بتایا اسلوب کردار یا شخصیت کا عکس ہے (گفن)

۳۔ سوئفٹ نے اسلوب کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ مناسب الفاظ کا مناسب جگہوں پر استعمال ہی اسلوب ہے۔

۴۔ ایمرسن نے اسلوب کو انسان کی ذہنی آواز کا نام دیا۔

۵۔ کوچ نے کہا کہ تحریر میں اسلوب ویسا ہی ہے جیسے دیگر انسانی تعلقات میں اچھی عادتیں۔

۶۔ مڈلٹن مرے کے خیال میں اسلوب سے مراد اظہار کی وہ ذاتی انفرادیت ہے جو شاعر وادیب کی شناخت ہے جس میں اظہار کا فن اور اعلا مقصود ادب شامل ہے۔

۷۔ لوکس کہتا ہے کہ اسلوب دراصل وہ طریقہ کار ہے جس سے فنکار دوسروں کو متاثر کرتا ہے۔

ہمارا خیال ہے بہر حال اسلوب کسی بھی ادیب وشاعر کی پہچان قائم کرتا ہے مگر بجائے خود شخصیت نہیں ہوتا کیونکہ ایک شخصیت کے کئی اسالیب ہو سکتے ہیں جس طرح انسانی

شخصیت ارتقا پذیر ہوتی ہے اسلوب بھی ارتقا پذیر ہوتا ہے۔لہذا کسی ایک مرحلے پر کسی شخصیت کی شناخت ممکن نہیں۔شخصیت کی طرح اسلوب بھی اک عمر میں بن پاتا ہے۔ شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں اس کا موروثی کردار، بول چال، رہن سہن، حرکات وسکنات اور اس کی نیت کا دخل ہوتا ہے۔اسی طرح اسلوب کو قائم کرنے میں (۱) فنکار کا تخلیل، (۲)لفظیات ،(۳)موضوعات کا انتخاب اور(۴) ان کو برتنے کا سلیقہ Treatment اہم رول ادا کرتا ہے۔

اسلوب کوئی راز سربستہ نہیں بلکہ کھلی حقیقت ہوتا ہے۔

جس طرح کیٹس نے اپنی ابتدائی شعری زندگی میں روایتی اسلوب کو اختیار کیا جو اس صدی میں مروج تھا اسی طرح اقبال نے بھی اپنی شعری زندگی کا آغاز اسی روایتی اسلوب سے کیا جو اس زمانے میں مانوس تھا۔پھر کیٹس Keats نے مختلف بحور اور اسلوبیاتی تجربات کے خوش آہنگ ارتباط سے اپنی پہچان قائم کرنے کی کوشش کی Walter Jackson Bate کے الفاظ میں

"First he (Keats) adopted conventional style of the century before then adopted numerous matrical & Stylistic devices for securing a combined luxury and freedom, a combination he associated with the intense and weighted expression which was a conscious goal in all his verses."...(8)

اقبال نے بتدأ وہی روش اختیار کی تھی جس کی اس زمانے کی ادبی فضا متحمل تھی۔ داغ کے چرچے چاروں طرف تھے اور بقول داغؔ

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغؔ

اقبال نے بھی داغ کی اتباع کی۔ جیسے

تامل تو تھا ان کو آنے میں قاصد مگر یہ بتا طرز انکار کیا تھی

مگر اقبالؔ کی غزل اس تامل و طرز انکار کی حدوں میں قید نہیں رہی بلکہ ذکر و فکر وجذب وسرور کی کئی منزلیں طے کر کے اس مقام تک گئی جہاں پہنچ کر شاعر کہتا ہے۔

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا

اقبال کے ہاں ڈرامائیت (ایلیٹ کے اصول، بیان خطابت اور خود کلامی) اس طرح ہے جس طرح پھول کی ہیئت، اس کا رنگ اور اس کی خوشبو جنھیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ اقبالؔ کا شعر آگے چل کر اعلاو ارفع مضمون تزئین (Emblishment) تطہیر، تصفیہ و تزکیہ کی وہ شکل اختیار کر گیا جو ان کے اسلوب کی معراج قرار پایا۔ غزل ہو کہ نظم اقبال نے اپنی بات پہنچانے میں سانچوں کو حائل ہونے نہیں دیا۔ کیٹس Keats نے پٹراک کے یا شکسپئر کے سٹائل کے بجائے Hunts کے سٹائل میں سانیٹ لکھے مگر ان سانیٹس کا فارم چاہے کچھ ہو کسی طرز کا ہو کیٹس نے ان سانیٹس میں اپنی پہچان قائم کر کے چھوڑی، سانیٹ کا نعم البدل مسدس تو نہیں مگر پابندی کے لحاظ سے ہمسر ضرور ہے۔ اقبالؔ نے مسدس جیسی مقبول و ممتاز اور اس زمانے میں مروج صنف میں ''ہمالہ'' سے لے کر ''شکوہ'' و''جواب شکوہ'' تک چھوٹی بڑی کئی نظمیں لکھیں اور ہر نظم میں اپنے مخصوص اسلوب کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ انیسؔ و دبیر کے بندھے ٹکے

Patent کربلائی مراثی کے علاوہ حالی کا ''مدو جزر اسلام'' اسی مسدس کے فارم میں شاہ کار شمار ہوتا ہے۔اسی صنف میں اقبال نے اپنے آپ کو آزمایا اور شکوہ و جواب شکوہ جیسا ایک اور ادبی شاہ کار دنیائے ادب کو دیا۔اگر مسدس کے فارم کی اہمیت صرف مرثیئے کی وجہ سے سمجھی جائے تو مختلف مرثیے بھی اسی فارم میں اقبال نے لکھے۔Keats کیٹس کے پاس لاطینی الفاظ کا استعمال بہت کم ہوتا ہے جبکہ اقبال کی اردو بہت مفرس ومعرب ہوا کرتی ہے۔دراصل اردو شاعری کا مزاج ہی کچھ ایسا ہے کہ فارسی وعربی الفاظ کے برمحل استعمال کے بغیر بات میں وزن پیدا کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی کہانی ''انشاءاللہ خاں انشاء'' تو کہہ سکتے ہیں مگر ابوالکلام آزاد ''غبار خاطر'' نہیں نکال سکتے۔ جس طرح لاطینی زبان کے ایک لفظ میں ایک یا ایک سے زیادہ جملوں کو سمیٹ لینے کی صلاحیت ہوتی ہے اسی طرح فارسی وعربی الفاظ کے بعض مرکبات ،بات کو جامع انداز میں پیش کرنے کا مزہ رکھتے ہیں یہی ایجاز ہی تو اعجاز بن جاتا ہے۔انگریزی زبان اردو کی بہ نسبت ظاہر ہے زیادہ تونگر Rich واقع ہوئی ہے۔اگر بعض مخصوص اصطلاحیں لاطینی زبان کی استعمال کی جائیں تو مختصر ترین الفاظ میں جامع و مانع نقطۂ نظر پیش کرنے میں سہولت ہوتی ہے ۔ شاید یہی سبب ہے کہ بیشتر عدالتی اصطلاحیں لاطینی الفاظ پر مشتمل ہیں alibi,Resgesta ,modus operandi وغیرہ وغیرہ اسی طرح اقبال نے اردو کی مشکل ترین مفرس معرب صورت اپنا کر اپنی بات آسانی سے پہنچانا چاہی اور جن مذہبی علائم کا استعمال ،اقبال بار بار کرتے ہیں ان کے لیے فارسی وعربی فضا کی تشکیل ضروری ہے ۔کیٹس چونکہ رومانی شاعر ہے اس لیے اسے لاطینی الفاظ یا عبرانی اصطلاحات کی ضرورت پیش نہیں آتی ،جبکہ ملٹن کا کام سیدھی سادی انگریزی سے نہیں چل سکتا۔کیونکہ اس

کے پاس جو انجیلی تلمیحات Bibilic Terms آتے ہیں ان کے پیش نظر زبان کے عمومی استعمال سے اوپر اٹھنا ضروری ہو جاتا ہے۔ کیٹس کہتا ہے:

I looked upon fine phrases like a lover

اس معاملے میں اقبال کیٹس کے ہم خیال ہی نہیں بلکہ اس سے بہت آگے نکل جاتے ہیں۔

سورج نے جاتے جاتے شام سیہ قبا کو
طشت افق سے لے کر لالے کے پھول مارے
تخم گل کی آنکھ زیر خاک بھی بے خواب ہے
کس قدر نشو و نما کے واسطے بے تاب ہے

کیٹس اور شیلی کے محاکات کے بالمقابل اقبال کا کلام آسانی سے رکھا جا سکتا۔ محاکات سے تو اقبال کا کلام بھرا پڑا ہے۔ کیٹس کہتا ہے۔

Sweeter by far than Hybles honied roses
When steeped in dew rich to intoxication
And when the moon her pallid face discloses
I will gather some by saells and incantation

Keats شدت تاثر کا قائل ہے وہ اپنی بات کو خوب تر انداز میں پیش کرتا ہے۔ شاعری یہی کچھ تو ہے اس کے لیے وہ بعض دفعہ ایک مصرع کو دوسرے مصرعے سے ملا بھی دیتا ہے جسے انگریزی میں Run on lines کہتے ہیں۔ اردو میں یہ طریقہ بہت کم ہے۔ ن۔م۔راشد اور اختر الایمان کی نظموں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ کیٹس کے ہاں Open and close vowels یعنی مختصر و طویل مصوتے Short and long vowels کا بالالتزام

استعمال پایا جاتا ہے اور Inter play of vowels کی وجہ سے کیٹس کی شاعری میں حسن پیدا ہوتا ہے جو اس کے اسلوب کی خاص پہچان بھی ہے۔

اقبال کے پاس بھی Long vowels (طویل مصوتے) بہت استعمال ہوئے ہیں

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا　　یا اپنا گریباں چاک یا دامن یزداں چاک

مسلماں ہے توحید میں گرم جوش　　مگر دل ابھی تک ہے زنار پوش

عشق دم جبرئیل عشق دل مصطفے　　عشق خدا کا رسول عشق خدا کا کلام

کمال جوش جنوں میں رہا میں گرم طواف　　خدا کا شکر سلامت رہا حرم کا غلاف

میسر آتی ہے فرصت فقط غلاموں کو　　نہیں ہے بندۂ حر کے لیے جہاں میں فراغ

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن　　قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے　　مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

اس طرح چاک، پوش، کلام، غلاف، فراغ، قرآن، آفاق وغیرہ Long vowels ہیں۔

کیٹس کے اسلوب کی ایک خاص شناخت یہ بھی ہے کہ وہ محدود بحروں کا شاعر نہیں بلکہ مختلف اور متنوع بحروں کا استعمال کیٹس کی شاعری کو یکسانیت کا شکار ہونے سے بچاتا ہے۔کیٹس خوبصورت الفاظ اور Phrases کا رسیا ہے وہیں وہ بار بار آہنگ بدل کر Metrical variation کے ذریعہ اپنے قارئین پر اثر انداز ہوتا ہے۔اسی طرح اقبال کے کلام میں بھی بحروں کا تنوع بہت ہے اقبال کے ہاں ''سلسلہ روز و شب نقش گر حادثات'' جیسی مترنم بحر کے علاوہ چھوٹی بڑی مختلف بحروں کا اس خوبی سے استعمال ہوا ہے کہ نظموں اور غزلوں میں یہ خوش آہنگی اقبال کی پہچان ہوگئی ہے۔مثنوی کی چھوٹی بحر میں ''ساقی نامہ'' مسدس کے فارم میں ''شکوہ و جواب شکوہ'' ''مسجد قرطبہ'' اور ''ذوق وشوق'' کی

خوش آہنگ بحر۔ ''والدہ مرحومہ کی یاد میں''۔ والا مرثیہ۔ کئی نظمیں، غزلیں، تنوع کی وجہ سے مزہ دیتی ہیں۔ اس طرح کیٹس اور اقبال کے اسلوب میں Metrical Variation مشترک ہے۔

Keats کے اسلوب کی پہچان جڑواں الفاظ کا استعمال بھی ہے ۔یعنی اکثر وہ دو دو لفظوں کے ٹکڑے بڑی خوبی سے استعمال کرتا ہے جیسے Elves Wolves & Fays & Bears وغیرہ ویسے کسی بھی زبان میں ایسے ٹکڑے شاعر کے بیان میں حسن پیدا کرتے ہیں اردو میں بھی ان کا استعمال کوئی غیر معمولی چیز نہیں مد و جزر، صبح و شام، نور و ظلمت وغیرہ وغیرہ تراکیب بہت عام ہیں۔ اقبال البتہ بعض تراکیب کو مخصوص اصطلاحات کا درجہ دے دیتے ہیں جیسے جبریل و ابلیس، عقل و عشق کرگس و شاہین، مومن و کافر وغیرہ اقبال دو مختلف کرداروں کے تضاد سے اپنی بات کو احسن طریقہ پر پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں یہی اقبال کا خاص اسلوب بھی ہے۔

Keats کے یہاں اکثر مصرعے Verbs سے شروع ہوتے ہیں۔ اقبال کے بعض مصرعوں میں Verbs کا استعمال ہی نہیں ہوتا جیسے ''مسجد قرطبہ'' کے بیشتر مصرعے:
سلسلہ روز و شب نقش گر حادثات اور عشق خدا کا رسول عشق خدا کا کلام۔! وغیرہ

ماخذ:

۱۔ Issues in stylistics CIEFL Hyderabad-7 (1980)

۲۔ The stylistic development of Keats by W.J. Bate

۳۔ اسلوب اور اسلوبیات از مرزا خلیل بیگ، شعبہ لسانیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔۱۹۸۳

☆☆☆

اقبال۔ادبِ اسلامی کا نقیب

ہر شاعر اپنے اسلوب سے پہچانا جاتا ہے۔جیسا کہ مشہور مقولہ ہے اسلوب ہی شخصیت ہے Style is the person۔جس کا اپنا اسلوب ہوتا ہے وہی منفرد ہوتا ہے۔یہی انفرادیت اس کی پہچان ہوتی ہے۔ورنہ کہنے کو تو دہلی سے لے کر مدراس تک قلم کاروں کی کوئی کمی نہیں ہے۔جب ایک خاص اسلوب اک خاص شاعر ادیب سے منسوب ہو جاتا ہے تو اس کے طرز پر کہنے والے اس خاص شاعر یا ادیب کے خوشہ چیں شمار ہونے لگتے ہیں یا پھر اس کی خوشہ چینی کو اپنے لیے باعث فخر سمجھنے لگتے ہیں۔میؔر کا اسلوب اس قدر بے مثال سمجھا گیا کہ اس کی نقل بھی ممکن نہ ہو سکی۔غالب کا انداز اختیار کرنا تو لوہے کے چنے چبانے کے مترادف سمجھا گیا یہی حال اقبال کی طرزِ فکر کا ہے۔اقبال کی پیروی کرنے کا یارا صرف اسی کو حاصل ہو سکتا ہے جو اقبال ہی کی طرح بے انتہا پڑھا لکھا Well Versed ہو۔ظاہر ہے اقبال کی علمیت ان کے فکر و فن میں بولتی دکھائی دیتی ہے اقبال کا کوئی ثانی پیدا نہ ہو سکا۔

یہ بات طے ہے کہ اقبال کا سرچشمہ قرآن و سنت ہے۔مغرب و مشرق کے دیگر فلسفے بھی اقبال کے پاس آ کر مشرف بہ اسلام ہو جاتے ہیں کیونکہ فراست کی بات مومن کا کھویا ہوا خزانہ ہے۔بچوں کے لیے نظمیں لکھتے ہوئے اقبال نے بعض انگریزی نظموں کے مرکزی خیال سے استفادہ کرتے ہوئے اسے مشرقی رنگ روپ دے کر گویا اپنا لیا ہے۔اگر

خود اقبال نے ان انگریزی نظموں کی نشاندہی نہ کی ہوتی تو ہر کس و ناکس کی رسائی ان تک ممکن نہ رہ جاتی مگر اقبال نے ایمانداری کے تقاضے کے طور پر اپنے ماخذات و مراجع کی خود نشاندہی کر کے مخالفین و حاسدین کے منہ بند کر دیئے۔ مغربی مفکرین سے استفادہ کرتے ہوئے بھی اقبال نے یہی رویہ اختیار کیا جیسے گوئٹے کے دیوانِ مغربی کے جواب میں ''پیام مشرق'' یا دانتے کی ڈیوائن کامیڈی کے جواب میں ''جاوید نامہ''۔

دراصل جو عالمی اقدار ہیں وہی اسلامی اقدار بھی ہیں۔ اسلام کو یوں بھی دینِ فطرت کہا گیا ہے۔ فطرت بہرحال حسن و خیر پر مائل ہوتی ہے۔ اقبال یقیناً مومن تھے۔ مومن ہونے کے ناتے قرآن کو اللہ کا کلام سمجھتے تھے جو انسانوں کی رہبری کے لیے نازل ہوا ہے اور ایک ''مردِ کامل'' ساری انسانیت کے لیے ''اسوۂ حسنہ'' کا نمونہ بنا کر بھیجا گیا ہے جو اقبال کا ہیرو بھی ہے۔

بمصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ اوٗ نرسیدی تمام بولہبیست

ایک اور جگہ اقبال حدیثِ قدسی کے انداز میں کہتے ہیں:

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

''ادبِ اسلامی'' کی اصطلاح پر ناک بھوں چڑھانے والے اس تقسیم و تحدید کی مخالفت پر کمربستہ ہو کر اپنے سیکولر ہونے کا ثبوت دینا چاہتے ہیں۔ اقبال سے بڑا سیکولر اور کون ہوسکتا ہے جس نے رام کو ''امام ہند'' کا نام دیا۔ گرونانک کو پنجاب کی سرزمین سے اٹھنے والا موحد قرار دیا۔ گائتری کے چند اشلوک کا منظوم روپ ''آفتاب'' کے نام سے اردو ادب کو دیا۔ بھرتری ہری کے نرم و نازک خیال کی پذیرائی کی۔ کارل مارکس کی تعریف میں کہا

ع نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب ،اور وہ مجذوب ،فرنگی کو مقامِ کبریا بتلانے کے جتن بھی کرتے ہیں ۔اقبال کا پیش کردہ فلسفہء خودی اسی طرح رازِ غیر سر بستہ Open Secret ہے جس طرح اللہ کا کلام ہے یا رسول اللہ کی ذاتِ مبارکہ ہے ۔قرآن یا رسول اللہ کوئی مسلمانوں کی جا گیر نہیں ہیں ۔رب العالمین اور رحمتہ اللعالمین کو محدود کرنے والے ہم کون؟ اقبال نے یہی کیا کہ قرآن وسنت کے پیغام کو عام کیا۔یہی ادبِ اسلامی ہے۔

انفرادی یا اجتماعی یعنی سماجی ،سیاسی ،تمدنی ،تہذیبی ،مذہبی ،قانونی ہر سطح پر ایک نقطہء نظر کے ماننے والے آپس میں قریب آتے ہیں اسی طرح اقبال نے ہر معاملے میں اسلامی نقطہء نظر کی تلاش کی اور اس کی ترویج واشاعت علی الاعلان کی ۔جس نقطہء نظر کو وہ بہتر سمجھتے تھے اس کو پھیلانا بھی چاہتے تھے ۔اقبال جہد وعمل کی حرکیاتی شخصیت کا نام ہے غلط نظریئے کا رد بھی انہوں نے کھل کر کیا ہے ۔مثلاً وطن پرستی کے راگ الاپنے والا اقبال ، وطن کو بہت بڑا بت بھی قرار دیتا ہے ۔اس طرح اپنے آپ کو رد کرنے کا حوصلہ بھی تو اقبال میں تھا۔شکوہ اور جوابِ شکوہ اس رد وقبول کی بہترین مثال ہے۔

ہمارے بعض روشن خیال احباب اقبال کو ادبِ اسلامی کا نقیب قرار دینے کو اقبال کو محدود کردینے کے مترادف سمجھتے ہیں حالانکہ اسلام کب محدود نظریہء حیات ہے یہ تو آفاقی نقطہء نظر پیش کرتا ہے اس طرح اگر اقبال ادبِ اسلامی کا نمائندہ شاعر ہے تو گویا آفاقی نظریہء حیات کا نقیب ٹھیرا۔اسلامی اصول وضوابط کی عکاسی بھلے ہی نام نہاد روشن خیال لوگوں کو کھلے مگر یہ روشن خیالی بجائے خود تنگ نظری کی غماز ہے۔اسلام ایک آفاقی سچائی ہے اس سچائی کا کھل کر اظہار کرنے والا بھی آفاقی فکر کا حامل کہلانے کا مستحق ہے ۔حق کا اظہار فی زمانہ جہاد سے کم نہیں اور اقبال اپنے دور کے سب سے بڑے مجاہد گزرے ہیں۔

ویسے اقبال سے اک ذرا پہلے مولانا خواجہ الطاف حسین حالی اور مومن خان مومن اور اقبال کے ہم عصروں میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خاں، مولانا ابوالکلام آزاد یہی کارنامے انجام دیتے رہے ہیں۔البتہ اپنے اپنے اسلوب کے فرق کے ساتھ ان کی اپنی جدو جہد فنی رچاؤ اور حسنِ معنی کی فراوانی سے شاہ کار ثابت ہوتی رہی ہے۔ظاہر ہے موعظۃِ حسنہ اور شاعرانہ لب ولہجہ میں بڑا فرق ہوتا ہے۔یہی فرق شاعر کی درجہ بندی کی بنیاد بنتا ہے زرخیز ذہن Fertile mind کے نمونے انیس و دبیر، دیا شنکر نسیم ،میر حسن ،محسن کاکوروی ،ریاض خیرآبادی ،داغ وامیر کے پاس وافر تعداد میں مل جاتے ہیں ۔علامہ اقبال نے مرد مومن کی خودی کی تربیت کے سامان کر کے اسے ''مرد کامل'' کے روپ میں دیکھنے کی آرزو کی ہے۔

ادبِ اسلامی کا نقیب ہونا ہی اقبال کو اقبال بناتا ہے ورنہ وہ بھی میر یا غالب یا داغ کی طرح کے کوئی شاعر ہو کے رہ جاتے جن کے ہاں شعر بہر حال شعر ہے ۔اپنے مشاہدات و تجربات کو قافیہ و ردیف کے حوالے کرنے کی مساعی ہے جب کہ اقبال نے تمام تر فنی رچاؤ کے ساتھ ایک اعلی وارفع مقصد کے اظہار کا وسیلہ اپنے شعر کو بنایا ہے جو ان کی کامیابی کی دلیل بھی ہے یہی فکر اسلامی اقبال کی پہچان ہے۔

ادب میں اشتراکی فکر کی نمائندگی کرنے والے شاعروں ادیبوں کو تو لوگ سر پر بٹھانے کو تیار ہیں فیض وفراق وفراز ،کیفی ،ساحر پر جان نثار کرنے آمادہ ہیں ،مخدوم کے گل تر کو سرخ سویرے میں کھلا دیکھنا چاہتے ہیں اور ہر عاشق ہے سردار یہاں ہر معشوقہ سلطانہ ہے یا پھر پیچھے کی طرف لوٹ کر قصہ کہانیوں ،داستانوں ،مرثیوں اور مثنویوں کے ڈھیر لگا دیتے ہیں ،انھیں ادب اور کلاسیکی ادب کا درجہ دینے میں پیش پیش ہیں مگر تکلیف

ہوتی ہے تو اقبال کی فکر سے اور اقبال کے حرکیاتی فلسفے سے جو سلانے کے بجائے بیداری کا پیغام دیتا ہے کیا یہی روشن خیالی ہے؟

اقبال کو روشن خیال ماننے میں آخر تامل کیوں ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اقبال کی زندہ فکر، زندہ اسلوب میں آج بھی زندگی کا پیغام دے رہی ہے۔ ایک خاص منشور کے تحت مزدور اور کسان کی ہم نوائی کرنے والے خوش حال لوگ جو ''ماسکو'' کو اپنا قبلہ سمجھتے تھے بکھر چکے ہیں روس کی شکست و ریخت کے بعد یہ لوگ تحویل قبلہ پر آمادہ ہوکر جدید یئے ہو گئے اور اپنی ذات کی پرتیں کھولنے کی آزادی کے نام پر اپنے آپ ہی پر ''شب خون'' مارتے مارتے تھک گئے۔

ثابت یہ ہوا کہ جتنے فلسفے ہیں سب محدود ہیں ان کے تحت تخلیق پانے والا ادب محدود دور میں محدود نقطۂ نظر کا عکاس ہوا کرتا تھا۔ ادبِ اسلامی لامحدود ہے۔ جب تک انسان باقی ہے اور جب تک انسان کا خالق زندہ ہے اس رشتے کے حوالے سے انفس و آفاق پر اظہار رائے ہوتا رہے گا اور اسی سچ، حسن اور خیر کی نمائندگی ہوتی رہے گی جو کبھی بدلنے والا نہیں اور جو کسی انسانی دماغ کی پیداوار نہیں بلکہ خالقِ کائنات کا عطا کردہ ہے اور اسی نقطۂ نظر کے حامل۔ ادبِ اسلامی کا نمائندہ اقبال ہے۔



اقبال کے اسلوب کا ارتقاء

مرا خیال ہے ادب، آرٹ، شعر یا اسلوب کی جامع تعریف کرنا حروف مقطعات کے معنی تلاش کرنے کے برابر ہے۔ اسلوب بجائے خود شخصیت نہیں ہوتا کیونکہ ایک شخصیت کے کئی اسالیب ہو سکتے ہیں۔ شخصیت ہو کہ اسلوب ارتقاء پذیر ہوتا ہے لہذا کسی ایک مرحلے پر کسی شخصیت کی شناخت ممکن نہیں۔ تاوقتیکہ تمام ارتقائی مراحل کا جائزہ نہ لیا جائے کسی کے بارے میں حکم لگانا اندھیرے میں تیر چلانے کے برابر ہے۔ شخصیت کی طرح اسلوب اک عمر میں بن پاتا ہے۔ جس طرح ذہنی ارتقاء ہوتا ہے اسی طرح اسلوبی ارتقاء بھی ہوتا ہے۔ جس طرح انسانی شخصیت موروثی کردار، بول چال، رہن سہن، حرکات وسکنات اور فکری سطح سے عبارت ہے اسی طرح کسی فنکار کے اسلوب کے تعین میں اس کا تخیل، انتخاب موضوع، لفظیات اور رویہ Treatment عمدہ معاون ثابت ہوتے ہیں اگر ہم کسی شاعر کا جائزہ لیں تو ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھا جائے گا کہ شعری وفنی روایت سے اس کا تعلق کس قسم کا ہے۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ وہ صبح بہت جلد بستر چھوڑ دیتا ہے، ہلکی سی ورزش کرتا ہے، نہاتا ہے، متوازن غذا استعمال کرتا ہے، خوب محنت کرتا ہے، بڑی سی بڑی الجھن کو ہیچ خیال کرتا ہے اور وقت پر گہری نیند سو جاتا ہے تو یہ اس کی صحت کا راز نہیں بلکہ یہ تو Open Secret ہے۔ اسی طرح اسلوب بھی جو فنکار کو شہرت ومقبولیت دوام بخشتا ہے راز غیر سر بستہ ہی ہوتا ہے۔

علامہ اقبال کے اسلوب کا جائزہ لینا کسی کافرہ کے تناسب اعضاء کا جائزہ لینے کے برابر ہے یہ وہ برہمن زادہ ہے جو مردمومن کی صفات کا نمونہ ہے جو کبھی بنیان اور تہمد پہن کر بان کی کھاٹ پر بیٹھا حقہ گڑگڑاتا ہے تو کبھی ڈنر سوٹ پہن کر عطیہ فیضی کے ساتھ لندن میں لذت کام ودہن میں مصروف ہے، یہ وہ شخص ہے جو اپنا نام تک صحیح نہیں بول سکتا مگر جسے حکومت افغانستان اپنے ملک کی تعلیمی پالیسی مرتب کرنے کے لیے سرراس مسعود اور سید سلیمان ندوی کے ہمراہ دعوت دیتی ہے، یہ وہ اقبال ہے جس کے لیے جہالت کے فتوے دیے گئے اور جو مارکس اور نطشے کے بارے میں مختلف جگہ اپنی رائے کو اس طرح درجہ ءاستناد دیتا ہے: ع نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب

کتابوں کا بغل میں دبائے پھرنا بھی پیٹھ پر لادے پھرنے کے درجے ہی میں ہے اسی اقبال کے اسلامی خطبات Reconstruction of Religious thought in Islam نے اندرون و بیرون مملک اک تہلکہ مچادیا، یہ وہی شاعر ہے جس کو بے سند پنجابڑہ اور مجہول ٹھیرایا گیا مگر جس نے بتایا کہ ایک ہی لفظ کو اردو میں کس نے کس مفہوم میں اور فارسی میں کس نے کس طرح استعمال کیا۔ (ملاحظہ ہو ’’علامہ اقبال کے ادبی معرکے نمبر ‘‘ نقوش ’’ جلد دوم) یہ وہی شاعر ہے جس نے خودی، بے خودی، جبریل وابلیس، عشق، جنوں، خرد، عقل وغیرہ الفاظ کو کتابی سطح سے اٹھا کر فکر کے اس آسمان پر روشن کر دیا جن سے زمین پر چلنے والوں کو اندھیری راتوں میں بھی راستے کے تعین میں سہولت ہو جاتی ہے، جسکے تخیل کی ترازو میں دنیاو عقبٰی دو غیر متوازن اجسام سے زیادہ نہیں۔

باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
کار جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

کہہ دے تو دنیا کا پلڑا اتنا جھک جاتا ہے کہ جنت و دوزخ بھی دوسرے پلڑے میں ہلکے پڑتے ہیں اور اگر یہ کہہ دے کہ

انہی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

تو ساری دنیا بھی اس ترازو کے ایک پلڑے میں خس و خاشاک سے زیادہ وزن نہیں رکھتی۔

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

اس طرح انفس و آفاق کے حوالے سے کافر و مومن کی تعریف Definition مقرر کرنے والا یہ شاعر لہو گرم رکھنے کے بہانے ہی نہیں بلکہ مشورے بھی دیتا ہے اور جو تخلیق انسان، نیابت علی الارض، تسخیر کائنات، شعور ذات جیسے اہم موضوعات پر سوچتا ہے بلکہ آپ کو ہم کو اپنی سوچ میں شریک ہونے کی دعوت بھی دیتا ہے۔

علامہ اقبال جن لفظوں کی نبضوں پر ہاتھ رکھ دیتے ہیں ان کی رفتار و حرکت میں اک حسن، اک تمکنت اور بارعونت اضافہ ہو جاتا ہے جیسے۔ عشق تمام مصطفےٰ عقل تمام بولہب

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی
خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

یہاں تک تو میں نے بین السطور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ علامہ اقبال کا تخیل، موضوع اور پسندیدہ لفظیات کیا ہیں۔ اب ایک چیز اور ہے رویہ Treatment جس طرح ایک غیور لڑکا کسی بھی بات کو عزت نفس کا مسئلہ بنا ڈالتا ہے یعنی وہی کہ

باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
کار جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

تو کہیں لاڈ پیار سے گلے میں باہیں بھی ڈال دیتا ہے جیسے۔

شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو اور کہیں احترام کی وہ کیفیت ہے کہ پکار اٹھتا ہے:

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں

یہ غیور شخصیت جابجا اقبال کے کلام میں ابھرتی ہے۔

اقبال کے اسلوب کا سورج ''ہمالہ'' نشان ہے۔ ویسے سر عبدالقادر کے بیان کے مطابق نو دس سال کی عمر ہی سے کلام موزوں اقبال کے منہ سے نکلنے لگا تھا لیکن ہر کلام موزوں شعر نہیں ہوتا چہ جائیکہ اس سے اسلوب کا اندازہ بھی ہو۔ جس نظم کو خود اقبال نے سرنامے کی طرح اپنے شعری مجموعے (بانگ درا) میں شامل کیا اور جوان کے قصر شہرت کا پہلا بنیادی پتھر ثابت ہوئی وہ ''ہمالہ'' ہی ہے۔ جس عمارت کا سنگ بنیاد ہمالہ ہو اس کی پائیداری اور اونچائی میں کسی شک وشبہ کی گنجائش کہاں نکلتی ہے۔ اب ایسے ہمالہ کو چھالیہ نہ پھوڑ سکنے کا طعنہ دینا صرف گلہری کو زیب دیتا ہے کہ علامہ اقبال کے فکر وفن کو کسی خاص دائرے میں محدود سمجھنا دراصل اپنی تنگ نظری کا ثبوت دینا ہے۔ ورنہ اقبال نے جس پتھر کو چھوا بت بنا دیا اور جس بت کو دیکھا توڑ دیا ایسی بت ساز و بت شکن شخصیت کا اسلوب کئی شب باشیوں اور سحر خیزیوں کے بعد سمجھ میں آتا ہے۔

''ہمالہ'' سے لے کر شکوہ اور جواب شکوہ تک اقبال کی فکر وہ قطعی نہیں جس سے کان آشنا رہے یہ وہ آواز نہیں تھی جو کب کی سنی ہوئی تھی بلکہ یہ ایک بالکل اچھوتی اور دل

موہ لینے والی آواز تھی جسے سن کر ہوائیں رک جانے لگیں اور اس کے سروں کو اپنے اندر جذب کرنے لگیں۔ اقبال کا لہجہ اک پوری قوم کی آواز بن گیا اور یہ نمائندہ اسلوب اک پوری شعری روایت سے کٹا ہوا ہونے کے باوجود اپنے اندر بلا کا شعری حسن اور انفرادیت لیے ہوئے تھا

مسدس جیسی صنف میں میرانیسؔ و مرزا دبیرؔ کے مراثی ہی نہ تھے بلکہ حالیؔ کا مدو جزر اسلام بھی موجود تھا (جسے سر سید اپنے اعمالنامے کی شاہ نیکی خیال کرتے تھے) ایسی ہئیت میں اقبال کا ''ہمالہ'' سے لے کر ''جواب شکوہ'' تک چھوٹی چھوٹی نظموں کے ذریعے اپنی پہچان قائم کرنے کی کوشش کرنا میرؔ کی زمین میں غالبؔ کی طرح کامیاب غزل کہنا ہے۔ اس اعتراف کے باوجود کہ ع آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میرؔ نہیں
غالبؔ جیسے شاعر نے مسدس جیسی صنف کو بھاری پتھر تھا چوم کر چھوڑا اور اسے انیس و دبیرؔ کی جاگیر میں مداخلت بے جا Encroachment سمجھا مگر اقبال نے اس زمین پر بھی اک قطعہ مکان تعمیر کر دکھایا ع زمیں جس کی چہارم آسماں ہے۔ ہمالہ سے جوابِ شکوہ تک اقبال نے اس مسدس کے فارم میں بیشتر نظمیں کہیں پھر اسے قابل اعتناء نہیں سمجھا۔ اب یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اقبال نے شعوری کوشش کے زیر اثر مسدس کو اپنے اظہار کے لیے منتخب کیا ہوگا بلکہ اقبال کے لاشعور میں صنف مسدس کی رعونت نے ہمالہ بن کے سر اٹھایا۔ ان نظموں کا موضوع کسی اور صنف کے بجائے مسدس ہی کا متقاضی تھا۔

اقبال کے اسلوب کے ارتقاء کا جائزہ اصناف ادب کی روشنی میں اگر لیں تو مسدس سر فہرست ٹھہرتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی پابند نظمیں بھی ہیں جیسے: ''نصیحت''۔

بچہ شاہیں سے کہتا تھا عقاب سال خورد
اے ترے شہپر پہ آساں رفعت چرخ بریں
ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام
سخت کوشی سے ہے تلخ زند گانی انگبیں
جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزہ ہے اے پسر
وہ مزہ شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں

ایسی کئی نظمیں ہیں جو دو دو تین تین چار چار اشعار پر مشتمل ہیں اور جو غزل کے فارم میں ہیں بعض نظمیں ہیں جو مثنوی کے فارم میں ہیں جیسے اک گائے اور بکری ،ماں کا خواب ، دوستارے، چانداور تارے پھر اقبال کے اسلوب کا ارتقا ''ساقی نامہ'' میں نظر آتا ہے جوان کی مشہور نظم ہے جو مثنوی کے فارم میں

رباعی کے مخصوص اوزان ہوتے ہیں مگر اقبال نے اپنے قطعات کو بھی رباعیات کا نام دیا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے نام میں کیا رکھا ہے۔ چار چار مصرعوں میں جو بات اقبال نے پیش کی اس کی اہمیت ہے

نہ مومن ہے نہ مومن کی امیری رہا صوفی گئی روشن ضمیری
خدا سے پھر وہی قلب ونظر مانگ نہیں ممکن امیری بے فقیری

علامہ اقبال نے مراثی بھی کہے مگر انیس و دبیر کی طرح اپنے موضوع اور فارم کو محدود نہیں کرلیا۔ انیس و دبیر کا مقصد زندگی ہی چونکہ رونا اور رلانا تھا اس لیے انہوں نے مرثیہ نگاری کا خاص اہتمام بھی اسی لیے کیا۔ اور سرزمین لکھنو ومسدس کو ''اشک آباد'' بنا کے چھوڑا۔ اردو ادب میں ان کربلائی مرثیوں کی جو اہمیت ہے وہ تو ظاہر ہے۔ اقبال نے پہلا

مرثیہ اردو ادب کے بہت بڑے شاعر ''مرزا غالبؔ'' کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے لکھا اور مسدس کے فارم میں لکھا۔

''سید کی لوح تربت پر'' وہ ایک عجیب خود کلامی سے کام لیتے ہیں اور چودہ شعر کی یہ نظم جس کا ہر شعر مطلع ہے اقبال کے فکری اسلوب کی اک جہت کی طرف اشارہ کرتی ہے

ہوا گر ہاتھوں میں تیرے خامہء معجز رقم
شیشہء دل ہو اگر تیرا مثال جام جم
پاک رکھ اپنی زبان تلمیذ رحمانی ہے تو
ہو نہ جائے دیکھنا تیری صدا بے آبرو
سونے والوں کو جگادے شعر کے اعجاز سے
خرمن باطل جلادے شعلہ آواز سے

''تصویر درد'' کے عنوان سے جو نظم ہے وہ بجائے خود قوم کا مرثیہ ہے اور جو ''ہشت غزلیہ'' ہے۔ جس کا لب لباب یہ ہے کہ

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

اور وہ کیا چیز ہے جس کے نہ سمجھنے کا وبال بے چہر گی ٹھیرے گا؟ وہی اقبال کا موضوع ہے اور وہی انسان کی تخلیق کا راز غیر سر بستہ بھی ہے۔

پھر اقبال نے اپنے استاد پروفیسر آرنلڈ کی یاد میں نالہء فراق کہا (وہی مسدس کے فارم میں)۔ ''بلالؓ '' کا مرثیہ لکھا جو تیرہ اشعار پر مشتمل ہے جس کا ہر شعر مطلع ہے۔ پھر تئیس مطلعوں پر مبنی اک اور مرثیہ اپنے اک اور استاد داغؔ دہلوی کا لکھا۔

ایک ہی قانونِ عالم گیر کے ہیں سب اثر
بوئے گل کا باغ سے گلچیں کا دنیا سے سفر

اقبال دلی کے نظام لدین اولیا کے مزار پر کھڑے ہوکر اسی طرح کی خود کلامی سے کام لیتے نظر آتے ہیں جیسی ''سید کی لوحِ تربت پر'' نظر آتی ہے۔ بیشتر ایسے نام بھی ہیں جن کے بارے میں اقبال کے شعری تاثرات بجائے خود رثائی جذبات کا اظہار بھی ہیں۔ فاطمہ بنت عبداللہ، شبلی و حالی، صدیقؓ، شکسپیئر ہمایوں (جسٹس شاہ دین کا مرثیہ) مرزا بیدل، خاقانی وغیرہ وغیرہ ''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' اقبال کا سب سے طویل، موثر اور فلسفیانہ مرثیہ ہے۔ رام اور نانک وغیرہ جیسے اوتاروں Reformers کے بارے میں اقبال کے تاثرات بجائے خود ان کا مرثیہ بھی ہیں۔

اقبال کے کلام کا بڑا حصہ حمد و نعت سے مملو ہے۔ حمد و نعت کے تانے اور بانے کے بغیر اقبال کی چادرِ زر کار کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا جو ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔

اقبال کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے نرے ہنرِ حرف بافی سے کبھی کام نہیں لیا بلکہ ہر حرف کو اعلیٰ ترین وجدانی سطح پر استعمال کیا ہے۔ حمد کے ساتھ ساتھ اقبال شکوہ کرنے کی جسارت بھی کر بیٹھتے ہیں مگر خلوصِ نیت کا وہ عالم ہے کہ خاکم بدہن کہنا نہیں بھولتے۔ عشقِ رسول ﷺ کے بغیر تو اقبال دو قدم بھی چل نہیں پاتے۔ اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبیست

وہ نظم جو مولانا الطاف حسین حالی اور مولانا محمد حسین آزاد کے ہاتھوں بت شکنیِ غزل کے طور پر شروع ہوئی تھی وہ اقبال کے پاس ایک ایسے دو رُخی بت کا روپ دھار گئی جسے ایک رخ سے دیکھیے تو غزل کی جان نظر آئے اور دوسری طرف سے دیکھیں تو نظم کی شان بھی دکھائی دے اور جو اقبال کے اسلوب کی پہچان بھی ٹہری۔ اقبال کی نظم و غزل میں

فرق کرنا مشکل ہے بیشتر نظمیں غزل کی شعریت کا نمونہ ہیں اور غزلیں اپنے اندرونی آہنگ اور داخلی مزاج کی وجہ سے اک مربوط اکائی ہیں جو نظم کا شناس نامہ ہے (طوالت کے خوف سے مثالیں نہیں دی جارہی ہیں)۔

اقبال نے جن مشکل قوافی کو اپنایا ہے ان سے اقبال کی علمیت کا یا زبان پر دسترس ہی کا اظہار نہیں ہوتا بلکہ اقبال کے مافی الضمیر کی ادائیگی کے لیے بھی ایسی ہی زبان ضروری بھی تھی۔ سہل ممتنع میں عورتوں سے / کی باتیں کرنے والی شاعری تو گلی کوچہ کا کوئی بھی شاعر کرسکتا تھا جسے غزل کے لغوی معنی معلوم ہیں۔ اصل آرٹ مصرع کہنا ہے بقولِ خیرؔ

شعر کہنا اگر آجائے تو مصرع کہنا
آتے آتے تمھیں آجائے گا مطلع کہنا



اقبال کا فلسفہء خودی

اردو شعر و ادب میں بھی دیگر زبانوں کی طرح علامات واستعارات کے حوالے سے اپنی بات بہتر سے بہتر انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے ۔شاعر کبھی گل و بلبل، گلچیں اور صیاد کی علامتوں کے ذریعے اپنا ماضی الضمیر ادا کرتے رہے تو کبھی بادہ و ساغر کے بہانے بہت کچھ کہہ جاتے حتیٰ کہ بقول غالبؔ

ہر چند ہو مشاہدہَ حق کی گفتگو بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

ہر دور کا اپنا محاورہ ہوتا ہے۔اسی محاورے میں بات بھلی لگتی ہے ۔بعض شاعروں کی مخصوص پسندیدہ علامتیں ہوتی ہیں جن کے ذریعے وہ اپنے دور کی عکاسی کرتے ہیں۔ترقی پسند شعراء نے دار و رسن ،زنجیر ،صبا ،خواب ،صحرا ،سمندر ،آئینہ ،دھوپ ،سایہ ،آنکھ وغیرہ کو اپنی ذات کی پرتیں کھولنے کے لیے چنا۔

اقبال کے فکر و فن کی طرح اقبال کی اپنی خاص علامتیں اور اصطلاحات ہیں جو صرف اقبال سے منسوب ہو کے رہ گئیں ۔کرگس و شاہین ،کافر و مومن ، ابلیس و جبرئیل وغیرہ وغیرہ۔

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور
کافر ہے تو تلوار پہ کرتا ہے بھروسہ
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

''خودی'' اقبال کی ایک خاص اصطلاح ہے جس کی تشریح خود اقبالؔ نے اپنی کتاب ''اسرارِ خودی'' کے دیباچے میں اس طرح کی ہے۔

''یہ لفظ اس نظم میں بہ معنی غرور استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ جیسا کہ عام طور پر اردو میں مستعمل ہے۔ اس کا مفہوم احساس نفس یا تعین ذات ہے''۔

''احساسِ نفس'' دراصل ''عرفانِ نفس'' ہے۔ بقول شخصے ''من عرف نفسہٗ فقد عرف ربّہٗ، جس نے اپنے آپ کو پہچانا اسی نے رب کو پہچانا (مخفی مباد یہ کوئی حدیثِ رسول نہیں ہے۔ خیر)۔ تعین ذات بھی دراصل خدا کی ذاتِ واحد اور اس کی لامحدود صفات کے ادراک کا نام ہے۔ یہی ''خودی'' ہے جو آخر کار ''قلب سلیم'' عطا کرتی ہے۔ اپنے اشعار میں اقبال نے جگہ جگہ خودی کی تشریح کی ہے۔

اقبال کے ہاں خودی ایک حرکی تصور ہے اقبال خانقاہی نظام، ملا و صوفی کی گوشہ نشینی اور تصوف کی بھول بھلیوں سے نالاں تھے۔ انہوں نے تصوف کے خلاف بے شمار نوٹس بھی جمع کیے تھے تا کہ ایک انقلابی کتاب لکھ ڈالیں مگر زندگی میں وہ یہ کام نہ کر سکے۔ البتہ ان کے نوٹ پر حاشیے دے کر پروفیسر صابر کلوروی نے ''تاریخ تصوف'' کے نام سے ایک کتاب ترتیب دی۔ اس کے علاوہ اقبال کے مشہور و ممتاز شارح پروفیسر سلیم چشتی نے تصوف کے خلاف معرکتہ الآرا مضامین لکھے جو ''اسلامی تصوف میں غیر اسلامی نظریات کی آمیزش'' کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ تصوف بے جھد گیان وھیان اور اک طرح کی راہبانہ نفس کشی کی تعلیم و ترغیب دیتا ہے۔ اس کے برخلاف اقبال مجاہدانہ طرز حیات کے قائل اور مبلغ تھے۔ اقبال کے خیال میں خودی، مرد مومن کا اثاثہ ہے۔ وہ کہتے ہیں

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

خودی کی یہ منزل تب آتی ہے جب ''اللہ کا ہاتھ بندۂ مومن کا ہاتھ'' ہو جاتا ہے۔ اس کے باوجود انھیں اس بات کا شعور ہے کہ

خودی کی شوخی و تندی میں کبر و ناز نہیں
جو ناز ہو بھی تو بے لذتِ نیاز نہیں
نگاہِ عشق دل زندہ کی تلاش میں ہے
شکارِ مردہ سزاوارِ شاہباز نہیں

اپنی نظم ''ساقی نامہ'' میں انہوں نے خودی کی زینہ بہ زینہ تشریح کی ہے۔

یہ موجِ نفس کیا ہے تلوار ہے — خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے
خودی کیا ہے راز درونِ حیات — خودی کیا ہے بیداری کائنات
خودی جلوہ بدمست و خلوت پسند — سمندر ہے اک بوند پانی میں بند

غالب کے خیال میں عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا مگر اقبال کوزہ میں سمندر کو بند کرنے کے قائل ہیں۔ من تو شدم تو من شدی کے اقبال قائل نہیں ہمیشہ ہمیشہ باقی رہنے والے خدا میں انسان کی فانی ہستی بھلا کیسے ضم ہو سکتی ہے۔ دونوں کا ملاپ ہی ناممکن ہے اسی واسطے اقبال خودی کی مزید تشریح کرتے ہوتے کہتے ہیں کہ اس خاکستر سے بڑے کام لیے جا سکتے ہیں۔

خودی میں ڈوبنے والوں کی عزم و ہمت نے
اس آبجو سے کیے بحرِ بے کراں پیدا
وہی زمانے کی گردش پہ غالب آتا ہے
جو ہر نفس سے کرے عمرِ جاوداں پیدا

خودی کوئی بیرونی شئے نہیں بلکہ اس کے اندرون ہی کا ایک حصہ ہے

اندھیرے اجالے میں ہے تابناک من وتو میں پیدا من وتو سے پاک

ازل اس کے پیچھے ابد سامنے نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے

خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے

اقبال نے ہمیشہ خودی کی تہذیب وترتیب پر زور دیا ہے۔ وہ خودی کو مثبت راستوں پر گامزن دیکھنا چاہتے ہیں کیونکہ اگر خودی کی صحیح طور پر پرورش ونگہہ داشت ہوتو وہ خودی کارآمد ٹھیرتی ہے۔

خودی کی پرورش وتربیت پہ ہے موقوف
کہ مشتِ خاک میں پیدا ہو آتشِ ہم سوز
یہی ہے سرِ کلیمی ہر اک زمانے میں
ہوائے دشت وشعیب وشبانی شب وروز

اگر خودی بھٹک جائے تو پھر مسولینی وہٹلر جنم لیتے ہیں

تہذیب کا کمال شرافت کا ہے زوال
غارت گری جہاں میں ہے اقوام کی معاش
ہر گرگ کو ہے برّہ معصوم کی تلاش

بقول اقبال ''خودی خواہ مسولینی کی ہو خواہ ہٹلر کی قانونِ الٰہی کی پابند ہو جائے تو مسلمان ہو جاتی ہے''۔ بہر حال حدودِ خودی کے تعین کا نام شریعت ہے۔ ہندی وایرانی صوفیہ میں سے اکثر نے مسئلہء فنا کی تفسیر فلسفہء ویدانت اور بدھ مت کے زیر اثر کی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان عملی اعتبار سے ناکارہ محض ہو کے رہ گئے اقبال کے عقیدے کی رو سے یہ

تغیر بغداد کی تباہی سے بھی زیادہ خطرناک تھا اور ایک معنی میں ان کی تمام تحریریں اسی تفسیر کے خلاف ایک قسم کی بغاوت ہے۔

خودی اور انا میں بڑا فرق ہے۔انا تو انانیت کا مادّہ ہے جو نفس کی نفسیانیت سے قریب ہے جبکہ خودی انا کی تہذیب اور عزتِ نفس پر دال ہے یہ تکلف اور تصوف دونوں سے دور ہے۔

حیات و موت نہیں التفات کے لائق
فقط خودی ہے خودی کی نگاہ کا مقصود

اقبال تو خودی کو پورے نظام شمسی سے بھی افضل واعلیٰ مانتے ہیں۔

مہ و ستارہ مثالِ شرارہ یک دو نفس
مئے خودی کا ابد تک سرور رہتا ہے

صاحبِ خودی کے اکرام وتکریم کا وہ عالم ہے کہ

فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا
ترے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے

اقبال کو خودی کے تصور سے عشق ہے۔یہ عشق اک اور صورت میں یوں جلوہ گر ہے

مہر و مہ و مشتری چند نفس کا فروغ
عشق سے پائندہ باد تیری خودی کا وجود

بلکہ اقبال تو یہاں تک کہتے ہیں کہ

ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

خودی کے زور سے دنیا پہ چھا جا ‏ مقامِ رنگ و بو کا راز پا جا
برنگِ بحر ساحل آشنا رہ ‏ کفِ ساحل سے دامن کھینچتا جا
خودی کی جلوتوں میں مصطفائی ‏ خودی کی خلوتوں میں کبریائی
زمین و آسمان و کرسی و عرش ‏ خودی کی زد میں ہے ساری خدائی

خودی کا تصور دے کر اقبال نے انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کی حجت تمام کر دی۔ اب اس خودی کو بے وقار نہ ہونے دینا بھی انسان کا فریضہ ہے۔

خودی ہو زندہ تو ہے فقر بھی شہنشاہی
نہیں ہے سنجر و طغرل سے کم شکوہِ فقیر
خودی ہو زندہ تو دریائے بے کراں پایاں
خودی ہو زندہ تو کہسار پرنیان و حریر

خودی تو ایک Open Secret ہے اس رازِ غیر سربستہ کو جاننے کے بیچ گردن کے اٹھانے اور جھکا لینے کا فاصلہ ہے۔

خودی کا سرِ نہاں لا الٰہ الا اللہ
خودی ہے تیغ فساں لا الٰہ الا اللہ

اقبال ''بے لذتِ خودی'' کے حامل کو غیرت دلاتے ہیں کہ

یہ ذکر نیم شبی یہ مراقبے یہ سرور
تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں

خودی کے بغیر زندگی کا کوئی تصور ہی نہیں ہے

خودی کی موت سے روحِ عرب ہے بے تب وتاب
بدن عراق و عجم کا ہے بے عروق و عظام
خودی کی موت سے مغرب کا اندروں بے سوز
خودی کی موت سے مشرق ہے مبتلائے جذام

وہ چاہے مغرب ہو کہ مشرق، شمال ہو کہ جنوب خودی سے سربلند ٹھہر سکتا ہے۔
بقول ظفر علی خاں:

خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

اپنی حالت کا احساس اور اُس کو بدل کر رکھ دینے کا حوصلہ ہی خودی کی پہچان ہے۔

جس بندۂ حق بیں کی خودی ہوگئی بیدار
شمشیر کی مانند ہے برندہ و براق
اس مردِ خدا سے کوئی نسبت نہیں تجھ کو
تو بندۂ آفاق ہے وہ صاحبِ آفاق

اقبال انقلابی فکر کے آدمی تھے۔ مرعوبیت و مجہولیت سے کوسوں دور۔ وہ قوم و ملت کو فعال، متحرک، موج زن اور سرخ رو ہی دیکھنا چاہتے تھے۔ سربلندی و سرافرازی سے کم کسی صورت پر بھی وہ سمجھوتا کرنے پر رضامند نہ تھے۔ اس کے لیے اقبال نے جو فلسفۂ خودی پیش کیا وہ تمام تر مثبت نکات پر مبنی ہے۔ مثبت مقصد کے حصول کے لیے مثبت راستوں پر ثابت قدمی کے ساتھ چلتے رہنا ہی لذتِ خودی ہے اور یہ لذتِ خودی جسے حاصل ہو جائے اس کے لیے ہر ذائقہ چھوٹا اور سبک ہو کے رہ جاتا ہے۔

تری زندگی اسی سے تری آبرو اسی سے
جو رہی خودی تو شاہی نہ رہی تو روسیاہی

مردِ افغان کو اقبال غیرت دلاتے ہوئے کہتے ہیں:

رومی بدلے شامی بدلے بدلا ہندوستان
تو بھی اے فرزندِ کہستاں اپنی خودی پہچان
اپنی خودی پہچان ۔۔۔او غافل افغان

ماخذ:

۱۔ اسلامی تصوف میں غیر اسلامی نظریات کی آمیزش۔ پروفیسر یوسف سلیم چشتی الحمد پبلی کیشنز۔ 2789 نیاریان سٹریٹ۔ GB روڈ دہلی۔۶ (1989)



اقبال۔ یورپ جانے سے پہلے

علامہ اقبال کی پیدائش (نومبر 1877) سیال کوٹ میں ہوئی وہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی اور ایف اے بھی سیال کوٹ ہی میں کامیاب کیا۔ بی۔ اے کرنے کے لیے اقبال کو لاہور جانا پڑا۔ وہیں اقبال کو ایک قابل اور مہربان استاد سرٹامس آرنلڈ سے استفادے کا زرین موقع ملا۔ فلسفے سے اقبال کی دل چسپی دیکھ کر آرنلڈ نے انھیں اپنی شاگردی میں لیا۔ پھر یہ تعلق اس قدر گہرا ہوگیا کہ انگلستان تک دونوں کے درمیان قائم رہا۔ اقبال کے دیگر کئی اساتذہ میں پروفیسر نکلسن اور براؤن رہے ہیں۔ نکلسن نے اقبال کی فارسی نظم ''اسرارِ خودی'' کا انگریزی میں سب سے پہلے ترجمہ کیا اور مغربی دنیا میں اقبال کو روشناس کروایا۔

انجمن حمایت اسلام کے ایک جلسے میں علامہ اقبال سے خواجہ الطاف حسین حالؔی کی نظم پڑھوائی گئی تھی تو خوش الحانی سے یہ نظم پڑھنے سے پہلے اقبال نے ایک قطعہ سنایا تھا:

مشہور زمانے میں ہے نام حالؔی معمور مئے حق سے ہے جامِ حالی
میں کشورِ شعر کا نبی ہوں گویا نازل ہے مرے لب پہ کلامِ حالی

پھر یوں بھی ہوا کہ اقبال اپنی نظمیں بھی ان جلسوں میں سنانے لگے۔ ایک ایسی ہی نظم ''ہمالہ'' ہے جو ایسے ہی ایک جلسے میں اقبال نے پڑھی تھی۔

سر شیخ عبدالقادر نے بانگِ درا کے دیباچے میں اقبال کی ابتدائی شعری زندگی کے بارے میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ جب وہ اپنا رسالہ ''مخزن'' نکالنے لگے تو اس کی

پہلی جلد کے پہلے ہی شمارے اپریل 1901 میں اقبال کی نظم ہمالہ شائع کی جو کافی مقبول ہوئی۔مخزن کے ہر نمبر کے لیے وہ اقبال کی کوئی نہ کوئی تخلیق حاصل کرتے رہے۔ یہ سلسلہ اقبال کے انگلستان جانے تک یعنی 1905 تک جاری رہا۔

اقبال کی شعر گوئی کا احوال بیان کرتے ہوئے سر شیخ عبدالقادر دیباچے میں رقم طراز ہیں:۔

''طبیعت زوروں پر تھی۔شعر کہنے کی طرف جس وقت مائل ہوتے تو غضب کی آمد ہوتی تھی ۔ایک ایک نشست میں بے شمار شعر ہو جاتے تھے۔ان کے دوست اور بعض طالب علم جو پاس ہوتے، پنسل کاغذ لے کر لکھتے جاتے اور وہ اپنی دھن میں کہتے جاتے۔ میں نے انھیں اس زمانے میں کبھی کاغذ قلم لے کر فکرِ سخن کرتے نہیں دیکھا موزوں الفاظ کا ایک دریا بہتا یا ایک چشمہ ابلتا معلوم ہوتا تھا''

(دیباچہ۔بانگِ درا۔سر شیخ عبدالقادر)

انھوں نے مزید لکھا کہ اقبال کے حافظے کا یہ عالم تھا کہ پورے پورے اشعار ترتیب کے ساتھ انھیں یاد رہتے تھے۔غالب کی شعر گوئی بھی عجیب وغریب تھی۔رات جب ان کے ہاں شعر ہوتے تھے تو ہر شعر پر اپنے ازار بند میں ایک گرہ لگاتے تھے۔صبح اٹھ کر ایک ایک گرہ کھولتے تھے اور شعر نوٹ کرتے جاتے تھے۔

بانگِ درا کا بیشتر کلام اقبال کے یورپ جانے سے پہلے کا کہا ہوا ہے۔اقبال کی فکر پر اسلاف کے کارناموں کی چھاپ تھی۔ان کی نظم ''ہمالہ'' ان کی شعری عمارت کا پہلا بنیادی پتھر ہے۔

اے ہمالہ اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں
چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں
تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں
تو جواں ہے گردشِ شام وسحر کے درمیاں
ایک جلوہ تھا کلیم طور سینا کے لیے
تو تجلی ہے سراپا چشمِ بینا کے لیے

سر شیخ عبدالقادر کے ''مخزن'' اپریل 1901 میں یہ نظم شائع ہوئی۔ اگلے ہی ماہ مئی 1901 میں گل رنگیں۔ ایک مہینے کے وقفے کے بعد جولائی 1901 میں اقبال کی نظم ''عہد طفلی'' مخزن میں شائع ہوئی پھر ایک مہینے کے وقفے سے ستمبر 1901 میں ''مرزا غالب'' کے لیے لکھا ہوا مرثیہ شائع ہوا۔

فکر انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تا کُجا
تھا سراپا روح تو۔ بزم سخن پیکر ترا
زیبِ محفل بھی رہا، محفل سے پنہاں بھی رہا
دید تیری آنکھ میں اس حسن کی منظور ہے
بن کے سوزِ زندگی ہر شئے میں جو مستور ہے

پھر ایک ماہ کے وقفے سے نومبر 1901 میں ان کی نظم ''ابر کوہسار'' مخزن میں شائع ہوئی یہ پانچوں نظمیں مسدس کے فارم میں ہیں۔ خواجہ الطاف حسین حالی کی ''مسدس مدو جزر اسلام'' کافی مقبول ہو چکی تھی۔ اس کے علاوہ انیس و دبیر کے مرثیے بھی اقبال کے کان میں پڑ چکے

تھے کیوں کہ اقبال کے اولین استادوں میں سید میر حسن تھے جو شیعہ تھے اور ان کے گھر میں مجلسیں برپا ہوتی تھیں۔ یہ وہی میر حسن ہیں جن کے لیے اقبال نے شمس العلماء کا خطاب انگریزوں سے مانگا تھا۔

علامہ اقبال نے بچوں کے لیے بھی چند اہم نظمیں لکھیں جن میں سے بعض انگریزی نظموں سے ماخوذ تھیں جیسے ایک پہاڑ اور گلہری۔ (ایمرسن سے ماخوذ) The mountain and the Squirrel، ایک مکڑا اور مکھی میری ہیوٹ Mary Hawitt کی نظم The Spider and the Fly سے ماخوذ ہے ایک گائے اور بکری Jane Taylor کی نظم The Cow and the Ass سے ماخوذ ہے اقبال نے اپنی خوش ذوقی کی وجہ سے گدھے کی جگہ بکری کو مناسب جانا۔ علامہ اقبال کی مشہورِ خاص و عام ''بچے کی دعا'' دراصل Metilda Betham میٹلڈا بیتھم کی نظم A Child's Hymn سے اٹھایا ہوا خیال ہے۔

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

بچوں کے لیے لکھی ہوئی اقبال کی نظم ''ہمدردی'' ولیم کوپر کی نظم (Nightingale and the Glowworm) سے استفادہ ہے۔

ٹہنی پہ کسی شجر کی تنہا بلبل تھا کوئی اداس بیٹھا

ماں کا خواب W. Barnes کی نظم The Mothers Dream سے اٹھایا ہوا خیال ہے۔

مارچ 1903 میں منشی سراج الدین کے نام ایک خط میں اقبال نے اپنی شاہ کار نظم ''پرندے کی فریاد'' لکھ بھیجی تھی۔

آ تا ہے یا د مجھ کو گز ر ا ہوا ز ما نہ
وہ باغ کی بہاریں وہ سب کا چہچہانا

یہ نظم ''مخزن'' فروری 1907 کے شمارے میں شائع ہوئی۔ بچوں کے لیے کہی ہوئی یہ ساری نظمیں اقبال نے یورپ جانے سے پہلے کہی تھیں۔

اقبال شروع ہی سے ایک سوچتا ہوا ذہن لے کر پیدا ہوئے تھے۔ جنت جہنم، موت وحیات کے تعلق سے اقبال کی فکر ان کی نظم ''خفتگانِ خاک سے استفسار'' سے ظاہر ہوتی ہے جو فروری 1902 کے مخزن میں شائع ہوئی تھی جس میں اقبال سوال پر سوال کیے جا رہے ہیں:

باغ ہے فردوس یا اک منزلِ آرام ہے ؟
یا رُخ بے پردۂ حسنِ ازل کا نام ہے ؟
کیا جہنم معصیت سوزی کی اک ترکیب ہے ؟
آگ کے شعلوں میں پنہاں مقصدِ تادیب ہے؟
کیا عوض رفتار کے اس دیس میں پرواز ہے ؟
موت کہتے ہیں جسے اہل زمیں کیا راز ہے ؟
اضطرابِ دل کا ساماں یاں کی ہست وبود ہے
علم انساں اس ولایت میں بھی کیا محدود ہے ؟
دید سے تسکین پا تا ہے دلِ مہجور بھی ؟
لن ترانی کہہ رہے ہیں کیا وہاں کے طور بھی ؟
جستجو میں ہے وہاں بھی روح کو آرام کیا ؟
واں بھی انساں ہے قتیلِ ذوقِ استفہام کیا ؟

آہ وہ کشور بھی تاریکی سے کیا معمور ہے ؟
یا محبت کی تجلی سے سراپا نور ہے ؟
تم بتا دو راز جو اس گنبد گرداں میں ہے
موت اک چبھتا ہوا کانٹا دلِ انساں میں ہے

ایسے ہی سوالات محمود شبستری نے بھی گلشن راز جدید میں اٹھائے تھے۔

علامہ اقبال نے شمع، پروانہ، عقل، دل، آرزو، آفتاب جیسی علامتوں سے کام لے کر اپنی فکر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ ساری نظمیں یورپ جانے سے پہلے کہی گئی ہیں۔ شمع و پروانہ (خدنگِ نظر۔ میں جنوری 1902) میں اور پھر دوبارہ مخزن اپریل 1902 میں شائع ہوئی۔

مرزا غلام احمد قادیانی سے اقبال کے ایک بھائی متاثر تھے۔ قادیانی چاہتے تھے کہ کسی طرح اقبال بھی ان کے حلقۂ اثر میں آجائیں۔ کہا جاتا ہے کہ اقبال نے قادیانی جماعت کے پیغام بیعت کے جواب میں ایک نظم کہی ''عقل ودل'' جو مخزن مئی 1902 میں شائع ہوئی پھر یہی نظم محمد الدین فوق کے ''پنجۂ فولاد'' لاہور 14 جون 1902 میں شائع ہوئی۔ ان کے بعد ہفت روزہ ''الحکم قادیان'' کے تین شماروں میں 1-7-14 فروری 1903 کو شائع ہوئی مخزن میں جب چھپی تو یہ نظم چالیس اشعار پر مشتمل تھی مگر بانگِ درا میں صرف تیرہ 13 اشعار ہی بار پا سکے۔ چونکہ یہ نظم ''الحکم قادیان'' میں بھی شائع ہو چکی ہے اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ یہ کسی قسم کی معذرتی نظم ہے اس میں عقل ودل کے مابین مکالمہ دکھایا گیا ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے تو نظم کے مختلف پرچوں میں شائع ہونے کا ذکر کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو ابتدائی کلام اقبال بہ ترتیبِ مہ و سال۔ اردو ریسرچ سنٹر حیدرآباد۔

سن اشاعت 1988) البتہ ڈاکٹر صابر کلوروی کی مرتبہ کلیات باقیاتِ شعر اقبال (متروک اردو کلام) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۔ سن اشاعت 2005 میں انھوں نے کچھ شعر ایسے دیے ہیں جن سے اقبال کا ذہن پڑھنے میں مدد ملتی ہے۔ اس میں بھی اقبال کی صلح کل والی مصلحت آمیز روِش کا پتہ چلتا ہے۔ وہ برے کو بھی برا کہنا نہیں چاہتے تھے۔

میں نے مانا کہ بے عمل ہوں میں　　رمزِ وحدت سے آشنا ہوں میں
میں کسی کو برا کہوں ۔ توبہ　　ساری دنیا سے خود برا ہوں میں
بھائیوں میں بگاڑ ہو جس سے　　اس عبادت کو کیا سرا ہوں میں

آخر میں بزرگوں سے تعلق اور خاص طور پر شیعیت کی طرف جھکاؤ کا اظہار ہوتا ہے۔

ہائے یہ دل ہو میرے پہلو میں　　تو یہ سمجھے کہ دہریا ہوں میں
اہلِ دل کو بگاڑ سے مطلب !　　سب بزرگوں کی خاک پا ہوں میں

فیض اقبال ہے اسی در کا
بندہ شاہِ لافتیٰ ہوں میں

کسی کا مشہور مصرع ہے ''لافتیٰ الا علی لا سیف الا ذوالفقار''

مخزن جنوری 1903 میں اقبال کی نظم ''سید کی لوحِ تربت'' پر شائع ہوئی ہے۔

بندۂ مومن کا دل بیم وریا سے پاک ہے
قوتِ فرماں روا کے سامنے بے باک ہے

اقبال نے سرسید کی وفات پر ''اِنی متوفیک ورافعک الی ومطھرک'' سے تاریخ وفات ۱۳۱۵ مطابق 1898 بھی نکالی تھی۔ اس طرح سرسید سے اپنی ذہنی یگانگت کا اقبال نے ثبوت دیا۔

اقبال کی ابتدائی زندگی میر حسن سیال کوٹی کی تربیت میں گزری اس لیے ان پر

شیعیت کا غلبہ رہا۔اس کے علاوہ شیعہ علما سے بھی اقبال متاثر تھے جیسے شیخ عبدالعلی تہرانی ہروی، شیخ عبدالکریم زنجانی وغیرہ اقبال اپنی نظم ''زہد اور رندی'' میں ایک مولوی صاحب کے حوالے سے اپنا تعارف کراتے ہیں:

اک مولوی صاحب کی سناتا ہوں کہانی
تیزی نہیں منظور طبیعت کی دکھانی
کہتے تھے کہ پنہاں ہے تصوف میں شریعت
جس طرح کہ الفاظ میں مضمر ہوں معانی
کرتے تھے بیاں آپ کرامات کا اپنی
منظور تھی تعداد مریدوں کی بڑھانی

اقبال کے بارے میں مولوی کی زبانی اپنا تعارف یوں دیتے ہیں

ہے اس کی طبیعت میں تشیع بھی ذرا سا
تفضیلِ علی ہم نے سنی اس کی زبانی

یہاں اقبال نے تکلف سے کام لیا ہے ورنہ مصرع یوں ہونا چاہئے تھا ع

ہے اس کی طبیعت میں تشیع بھی بلا کا

حضرات ابوبکر، عمر، عثمان رضی اللہ عنہم پر حضرت علی کو تبھی فضیلت دی جاسکتی ہے۔

ڈاکٹر اکبر حیدری کا ایک مقالہ ان کی پہلی برسی کے موقع پر ماہ نامہ ''حکیم الامت'' ستمبر 2013 کے شمارے میں شائع ہوا ہے جس میں کہا گیا ہے:

''1903 ہی میں اقبال کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد (م 1940) جو اقبال کے کفیل تھے، ایبٹ آباد ہزارہ میں سب ڈویژنل آفیسر ملٹری تھے کسی فوجداری مقدمے میں

ملوث پائے گئے۔(گیان چند جین نے سب اور سیر لکھا ہے) اقبال ان کی رہائی کے لیے بے حد پریشان تھے انھوں نے غم غلط کرنے کے لیے ایک نظم ''برگِ گل'' کے عنوان سے لکھی اور اپنے یار (؟) حضرت خواجہ حسن نظامی کے توسل سے خواجہ نظام الدین اولیا کی درگاہ دہلی میں نذرانے کے طور پر آویزاں کرائی تھی۔(یہ نظم مخزن ستمبر 1903 میں شائع ہو چکی ہے) ''برگ گل'' اقبال کے متداول دیوان میں تو نہیں شامل ہے مگر صابر کلوروی نے متروک اردو کلام میں اس کا ذکر ضرور کیا ہے اور پوری طویل نظم بھی دی ہے۔اقبال کی ذہنیت سے آ گہی کے لیے ہم یہاں دو چار اشعار پیش کرتے ہیں۔

کیوں نہ ہوں ارماں مرے دل میں کلیم اللہ کے
طور در آغوش ہیں ذرے تری درگاہ کے

اپنے بھائی عطا محمد کے حوالے سے جو سرکاری نوکری سے معطل ہو کر سزا بھگت رہے تھے۔ اقبال کہتے ہیں:

ہو اگر یوسف مرا زحمت کشِ چاہِ الم
چین آئے مصر آزادی میں پھر کیوں کر مجھے
رونے والا ہوں شہیدِ کربلا کے غم میں ۔ میں
کیا دُرِ مقصد نہ دیں گے ساقیِ کوثر مجھے
جا ہی پہنچے گی صدا پنجاب سے دہلی تلک
کر دیا ہے گرچہ اس غم نے بہت لاغر مجھے

اقبال نے یہ نظم خواجہ حسن نظامی کے توسل سے درگاہ میں لٹکانے کے لیے بھیج دی تھی وہ اس کا جواز یہ پیش کرتے ہیں:

آہ تیرے سامنے آنے کے نا قابل ہوں میں
منہ چھپا کر مانگتا ہوں تجھ سے وہ سائل ہوں میں

متروک کلام سمجھ کر اسے نظر انداز کر دیا جا سکتا تھا مگر اسی نوعیت کی ایک اور نظم ''التجائے مسافر'' بھی اقبال کے قلم سے نکلی جو ''بانگِ درا'' میں شامل ہے اور جو مخزن اکتوبر 1905 میں شائع ہوئی۔ یورپ کے لیے رختِ سفر باندھنے سے پہلے اقبال اپنا بھائی، خیال رکھنے کے لیے حضرت نظام الدین اولیاؒ کے حوالے کر جاتے ہیں۔ ان کی یہ نظم التجائے مسافر (بہ درگاہِ حضرتِ محبوب الٰہی دہلی) آج بھی وہاں کندہ دیکھی جا سکتی ہے۔ اقبال کہتے ہیں:

فرشتے پڑھتے ہیں جس کو وہ نام ہے تیرا
بڑی جناب تری فیض عام ہے تیرا
تری لحد کی زیارت ہے زندگی دل کی
مسیح و خضر سے اونچا مقام ہے تیرا

نظم میں آگے وہ کچھ گزارشات بھی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اپنے ماں باپ، شیعہ استاد میر حسن اور معطل شدہ بھائی عطا محمد سے اپنے قلبی لگاؤ کا اظہار بھی کرتے ہیں:۔

مری زبانِ قلم سے کسی کا دل نہ دکھے
کسی سے شکوہ نہ ہو زیرِ آسماں مجھ کو
پھر آ رکھوں قدم مادر و پدر پہ جبیں
کیا جنھوں نے محبت کا رازداں مجھ کو

وہ شمع بارگہِ خاندانِ مرتضوی
رہے گا مثلِ حرم جس کا آستاں مجھ کو
وہ میرا یوسف ثانی وہ شمع محفلِ عشق
ہوئی ہے جس کی اخوت قرارِ جاں مجھ کو
جلا کے جس کی محبت نے دفترِ من و تو
ہوائے عشق میں پالا ۔کیا جواں مجھ کو
ریاضِ دہر میں مانندِ گل رہے خنداں
کہ ہے عزیز تر از جاں وہ جانِ جاں مجھ کو
شگفتہ ہو کے کلی دل کی پھول ہو جائے
یہ التجائے مسافر قبول ہو جائے

انگلستان روانہ ہونے سے پہلے اقبال نے اپنے جذبات ''التجائے مسافر'' کے عنوان سے بارگاہِ حضرت محبوب الٰہیؒ میں پیش کیے کہ وہ ان کے عزیزوں کا خیال رکھیں۔ اطلاعاً عرض ہے کہ اقبال کی پہلی بیوی کریم بی بی کے والد بھی ڈاکٹر عطا محمد کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے اولین سند یافتہ تھے وہ جدہ میں حکومتِ برطانیہ کی طرف سے وائس قونصل رہ چکے تھے۔ پھر پنجاب کے مختلف اضلاع میں سول سرجن بھی تعینات رہ چکے تھے۔ بے پناہ دولت کے مالک تھے۔ گجرات کے محلّہ شال بافاں کی ایک محل نما حویلی میں رہتے تھے۔ اقبال نے ان کی بیٹی کریم بی بی سے قطع تعلق کرلیا تھا ورنہ وہ اقبال کے تعلیمی اخراجات برداشت کر سکتے تھے۔ایسی صورت میں انہی کے ہم نام شیخ عطا محمد جو اقبال کے بڑے بھائی تھے،اقبال کی پرورش میں حصہ لے رہے تھے۔ ورنہ اقبال کے والد شیخ نتھو عرف شیخ نور محمد تو

ٹوپیاں سی کر گزارا کرتے تھے۔ وہ بھلا اقبال کو اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان کیسے بھیج سکتے تھے اسی لیے اقبال اپنے بڑے بھائی عطا محمد معطل شدہ کے لیے بہت زیادہ فکر مند تھے۔ انگلستان جانے سے پہلے انہیں حضرت محبوب الٰہی کو سونپا کہ دوبارہ انھیں ملازمت پر بحال کروا دیں۔ نظم ''التجائے مسافر'' کے بہت سارے شعر اقبال نے حذف کر ڈالے تھے۔ ایک شعر میں حسن نظامی کا شکریہ بھی ادا کیا۔

بھلا ہو دونوں جہاں میں حسن نظامی کا
ملا ہے جس کی بدولت یہ آستاں مجھ کو

یہ وہی حسن نظامی ہیں جنھوں نے اقبال کے خلاف ایک مہم چلائی تھی جب اقبال حافظ شیرازی اور تصوف کے خلاف لکھ رہے تھے۔

یورپ جانے سے پہلے اقبال وطن کی محبت میں سرشار تھے۔ ہندو مسلم اتحاد کے متمنی تھے اور سیکولر نظمیں لکھیں۔ انسانیت کے پیغام کو عام کیا۔ ان کا ''ترانہ ہندی''

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

بہت مقبول ہوا اس کی مقبولیت میں آج تک کمی نہیں آئی۔ یہ ترانہ ہندی 16 اگست 1904 کو لکھا گیا تھا۔ سب سے پہلے دیا نرائن نگم کے ''زمانہ'' ستمبر 1904 میں اور پھر مخزن اکتوبر 1904 میں شائع ہوا۔ ہندوستان میں تو یہ قومی ترانے کا درجہ رکھتا ہے۔ پھر اقبال کی فکر میں تبدیلی آئی وہ وطنیت سے آفاقیت تک پہنچے۔

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

گویا۔ ہر ملک، ملک ماست کہ ملکِ خدائے ماست۔

''ہندوستانی بچوں کا قومی گیت'' بھی حُبِ وطن کا شاہ کار سمجھا جاتا ہے۔ یہ گیت مخزن فروری 1905 میں شائع ہوا ہے۔

چشتی نے جس زمیں میں پیغامِ حق سنایا
نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا
جس نے حجازیوں سے دشتِ عرب چھڑایا
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

اسی سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے اقبال نے ہندوستانیوں کو آپس میں مل جل کر رہنے کی ترغیب دی اور ایک ''نیا شوالہ'' تعمیر کرنے کا مشورہ دیا تھا:

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہوگئے پرانے
پتھر کی مورتوں کو سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے
آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں، نقشِ دوئی مٹا دیں
شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

علامہ اقبال من حیث القوم تمام ہندوستانیوں کے لیے نیک خواہشات وجذبات رکھتے تھے۔ انجمن حمایت اسلام میں پڑھی جانے والی نظم ''تصویر درد'' مارچ 1904 کے مخزن میں شائع ہوئی تھی۔ اس نظم میں اقبال نے اشاروں کنایوں میں اپنا درد بیان کرنے کی کوشش کی ہے:

نہیں منت کشِ تابِ شنیدن داستاں میری
خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری
یہ دستورِ زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری
اٹھائے کچھ ورق لالے نے کچھ نرگس نے کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری
وطن کی فکر کر، ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

.....

زمیں کیا آسماں بھی تیری کج بینی پہ روتا ہے
غضب ہے سطرِ قرآں کو چلیپا کر دیا تو نے
زباں سے گر کیا توحید کا دعویٰ تو کیا حاصل
بنایا ہے بتِ پندار کو اپنا خدا تو نے

اقبال نے نظموں غزلوں کے ساتھ ساتھ اپنے بعض استادوں کے مرثیے بھی کہے جیسے مئی 1904 کے مخزن میں ''نالہ فراق'' کے عنوان سے فلسفے کے اپنے استاد آرنلڈ کی یاد میں مسدس کے فارم میں ایک مرثیہ کہا:

تو کہاں ہے اے کلیم ذرہ سینائے علم
تھی تری موجِ نفس بادِ نشاط افزائے علم
اب کہاں وہ شوقِ رہ پیمائی صحرائے علم
تیرے دم سے تھا ہمارے سر میں بھی سودائے علم

اپریل 1905 کے مخزن میں اپنے ایک استاد داغؔ دہلوی کا مرثیہ اقبال نے شائع کروایا۔

چل بسا داغ آہ میت اس کی زیبِ دوش ہے
آخری شاعر جہان آباد کا خاموش ہے

علامہ اقبال نے داغ کی تاریخ وفات ان کے نام ہی سے نکال کر اپنی ذہانت کا ثبوت بھی دیا تھا۔ ''نواب میرزا داغ'' جس سے 1322 ہجری نکلتی ہے جو داغ کی وفات کا سن ہے۔

یورپ جانے سے پہلے نوجوان اقبال نے اس دور کی روایت کے مطابق رومانی غزلیں کہیں۔

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی | مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی
تمہارے پیامی نے سب راز کھولا | خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی
تامّل تو تھا ان کو آنے میں قاصد | مگر یہ بتا طرزِ انکار کیا تھی

یہ غزل مخزن جون 1901 میں شائع ہوئی تھی ۔ پھر مخزن نومبر 1901 میں جو غزل شائع ہوئی اس کا مطلع ہے:

لاؤں وہ تنکے کہاں سے آشیانے کے لیے
بجلیاں بے تاب ہوں جن کو جلانے کے لیے

1903 میں کہی ہوئی غزل فروری کے مخزن میں اور ''خدنگِ نظر'' میں شائع ہوئی جس کا آخری شعر ہے:

میرے مٹنے کا تماشا دیکھنے کی چیز تھی
کیا بتاؤں ان کا میرا سامنا کیوں کر ہوا

1904 کے دکن ریویو میں اقبال کی ایک اور دل چسپ غزل شائع ہوئی جس کا مطلع و مقطع ہے

انوکھی وضع ہے سارے زمانے سے نرالے ہیں
یہ عاشق کونسی بستی کے یارب رہنے والے ہیں
مرے اشعار اے اقبال کیوں پیارے نہ ہوں مجھ کو
مرے ٹوٹے ہوئے دل کے یہ درد انگیز نالے ہیں

اقبال کی ایک غزل فروری 1903 میں کہی گئی تھی مگر اپریل 1903 کے مخزن میں شائع ہوئی

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی

ایک اور مشہور و مقبول غزل مخزن جنوری 1904 میں شائع ہوئی ۔

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں   مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں
بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی   بڑا بے ادب ہوں سزا چاہتا ہوں

اقبال یوں تو داغ کے شاگرد تھے مگر انہیں گہری دلی عقیدت امیر مینائی سے تھی۔ انھوں نے امیر مینائی کے مصرع ''غزل کیا ہے یہ پھولوں سے بھری گل چیں کی جھولی ہے''۔ پر اُنیس 19 شعر کی بڑی رومانی غزل کہی مگر اسے اپنے متداول دیوان میں شامل نہیں رکھا۔

لڑکپن کے ہیں دن صورت کسی کی بھولی بھولی ہے

زباں میٹھی ہے، لب ہنستے ہیں پیاری پیاری بولی ہے

اقبال نے امیر مینائی کی وفات پر قرآنی آیت ''لسان صدق فی الآخرین'' سے ان کی تاریخ وفات ۱۳۱۸ھ نکالی تھی اور ان کے فکر و فن پر انگریزی میں ایک جامع مضمون لکھنا چاہتے تھے۔ امیر مینائی کی زمین میں کہی ہوئی مذکورہ بالا غزل سیال کوٹ کے رئیس آغا محمد باقر خاں قزلباش آنریری مجسٹریٹ کے بیٹے محمد ناصر کے ختنے کے غسل صحت کے موقع پر کہی گئی تھی جو مخزن اپریل 1903 میں شائع ہوئی۔ ایسی ہلکی پھلکی لمحاتی شاعری جو تفنن طبع کے طور پر کہی گئی تھی اقبال کے شایانِ شان نہیں تھی۔ اپنے معیار سے فروتر ہونے کی وجہ سے ایسی تمام تخلیقات اقبال نے رد کر دیں۔

اقبال نے اپنی بے شمار نظمیں غزلیں کبھی پوری کی پوری اور کبھی جزوی طور پر مسترد کر دیں۔ ''ابتدائی کلام اقبال بہ ترتیب مہ و سال'' مطبوعہ اردو ریسرچ سنٹر حیدرآباد سن اشاعت 1988 میں ڈاکٹر گیان چند جین نے کافی تفصیلات جمع کر دی ہیں۔ کلیات باقیاتِ شعر اقبال متروک اردو کلام میں ڈکٹر صابر کلوروی نے بھی ایسی کئی تخلیقات شائع کیں جنہیں اقبال نے نظر انداز کر دیا تھا۔ (مذکورہ کتاب ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے 2005 میں شائع ہوئی)

اس میں شک نہیں اقبال نے اپنا بہت سارا کلام خود ہی رد کر دیا تھا مگر ان کے عقیدت مندوں نے اسے بھی ڈھونڈ نکالا جس طرح غالب کا رد کردہ کلام بھی منظر عام پر لایا گیا

گیان چند جین نے اقبال کے کلام میں عروض وزبان وبیان کی خامیوں کی نشان دہی بھی کی اور گواہی میں لبھو رام جوش ملسیانی کو پیش کیا جو خود کبھی کوئی اچھا شعر نہ کہہ سکے نہ کسی خوش ذوق کو ان کا شعر ہی یاد ہے مگر جوش ملسیانی نے ایک کتابچہ ''اقبال کی خامیاں'' لکھا تھا۔

عزیز احمد نے سب سے پہلے اقبال کے رد کردہ کلام کے سلسلے میں تحقیقی مضمون لکھ کر ماہرین اقبالیات کو چونکایا تھا۔ مگر حیرت کی بات ہے کہ بعد میں اس موضوع پر کام کرنے والوں نے عزیز احمد کی تحقیق کا کوئی ذکر ہی نہیں کیا۔

اقبال کا پہلا اردو مجموعہ کلام ''بانگِ درا'' سب سے پہلے ستمبر 1924ء میں شائع ہوا اس سے چند ماہ پیشتر اقبال کے ایک معتقد مولوی محمد عبدالرزاق نے 220 صفحات پر مشتمل ایک مجموعہ ''کلیاتِ اقبال'' کے نام سے شائع کر دیا تھا۔ اس میں اقبال کا کلام بالکل اسی طرح چھاپا گیا تھا جیسا وہ مخزن اور دوسرے رسائل واخبارات میں چھپتا رہا تھا۔ کلیاتِ اقبال کے شروع میں مولوی عبدالرزاق کا لکھا ہوا 136 صفحات کا ایک دیباچہ بھی شامل تھا۔ انھوں نے اپنے طور پر چند عنوانات کے تحت کلام اقبال کی درجہ بندی بھی کی تھی۔ اقبال کو موصوف کی یہ حرکت پسند نہیں آئی کہ ان کے سارے کلام کا مجموعہ ان کی اجازت اور بلا نظر ثانی شائع کر دیا گیا۔ تصفیے کے تحت کلیاتِ اقبال کی فروخت بند کر دی گئی اور غیر فروخت شدہ ساری جلدیں اقبال کے حوالے کر دی گئیں۔

1923ء ہی میں احمد دین نے بھی اقبال کی اجازت کے بغیر ایک مجموعہ ''اقبال'' شائع کیا تھا مگر اقبال کی ناراضگی کے پیش نظر ساری جلدیں نذرِ آتش کر دی گئیں۔ پھر بھی چند ایک نسخے بچ گئے تھے۔ اسی مجموعے ''اقبال'' کو مشفق خواجہ نے 1979ء میں دوبارہ شائع کیا تھا۔

عزیز احمد نے اپنی وفات 16/ڈسمبر 1978ء سے بہت پہلے ایسی نظمیں کھوج نکالیں اور ایسے اشعار کی نشان دہی کی جنھیں ''بانگِ درا'' کی ترتیب کے وقت اقبال نے رد کر دیا تھا جیسے کنج تنہائی، دنیا، مفلسی، نوائے غم وغیرہ نظمیں جو بانگِ درا میں شامل نہیں۔ بعض نظموں میں اقبال نے بعد میں حذف واضافہ کیا تھا۔ غزلوں کے اشعار میں بھی ترمیم کی تھی۔

عزیز احمد نے بتایا کہ اقبال نے اپنے کلام کا جو حصہ رد کیا وہ تین اصول کے تحت تھا

(1) ایسی نظمیں جہاں مذہب یا ملی تصور سے براہِ راست تضاد پیدا ہوتا تھا جیسے ''نیا شوالہ'' کا وہ حصہ جس میں بت پرستی اور وحدت الوجود دونوں شامل ہیں۔

(2) زبان و بیان کی درستی کے پیشِ نظر کئی نظمیں خارج کر دیں۔

(3) امراء کی مدح کو حذف کر دیا جیسے مہاراجہ کشن پرشاد کے متعلق بہت سے اشعار۔

(بحوالہ گم گشتہ متاعِ عزیز۔ مرتبہ ڈاکٹر صدیق جاوید۔ مغربی پاکستان اردو اکاڈیمی ستمبر 2008ء)

گیان چند جین نے حیدرآباد کے مشہور زمانہ عبدالصمد خاں کے نادر و نایاب کتب و رسائل پر مشتمل کتب خانہ (اردو ریسرچ سنٹر) سے استفادہ کرتے ہوئے ابتدائی کلامِ اقبال بہ ترتیبِ مہ و سال 1988ء میں شائع کیا جس میں اقبال کے متروک کلام کی نشان دہی بھی کی گئی ہے۔

اقبال کے متروک اردو کلام پر مشتمل ''کلیاتِ باقیاتِ شعر اقبال'' مرتبہ ڈاکٹر صابر کلوروی 2005ء میں شائع ہوا ہے۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ اس موضوع پر سب سے پہلے کام کرنے والے عزیز احمد کا دونوں مرتبین نے قطعی ذکر نہیں کیا ہے۔

ڈاکٹر ظ۔ انصاری زندگی بھر کمیونزم کی حمایت کرتے رہے مگر آخری عمر میں تائب ہو کر انھوں نے ایسی تمام کتابوں کو علی الاعلان Disown کر دیا۔ (وجہ چاہے کچھ رہی ہو)

تصوف کو اسلام کی سرزمین میں اجنبی پودا قرار دینے والے علامہ اقبال نے تصوف کو شریعت اور قرآنی تعلیمات کے خلاف سمجھتے ہوئے محی الدین ابن عربی اور حافظ کو دین اسلام کے لیے مضر قرار دیا مگر صوفیانہ عقائد سے ہمیشہ وابستہ بھی رہے۔ بلا جھجک یہ بھی اعتراف کیا

پوچھتے کیا ہو مذہبِ اقبال یہ گنہگار بو ترابی ہے
بغض اصحابِ ثلاثہ سے نہیں اقبال کو دق مگر اک خارجی سے آ کے مولائی ہوا

خواجہ اجمیری ، محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیا، شیخ احمد سر ہندی جیسے بزرگوں سے اقبال کو عقیدت رہی ۔ یہاں تک کہ اقبال اپنے بیٹے دس سالہ جاوید اقبال کو لے کر 1934 میں شیخ احمد سرہندی کے مزار پر حاضری دیتے ہیں کیوں کہ انہوں نے منت مانی تھی کہ جاوید جب دس سال کے ہو جائیں گے تو انھیں سرہند لے آئیں گے۔ مخفی مباد کہ جاوید کی پیدائش اکتوبر 1924 کی ہے۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ اقبال کی عقیدت بزرگانِ دین سے آخری عمر تک برقرار رہی۔ اقبال کا کمال تو یہ ہے

بدعتی اور خبیث بھی خوش تھے
اُن سے اہل حدیث بھی خوش تھے



ضربِ کلیم کا مردِ مسلماں

یہ بات طے ہے کہ علامہ اقبال کی فکر کا سر چشمہ کلام اللہ ہے ۔ جس قدر فیض اقبال نے قرآن مجید سے اٹھایا ہے شاید ہی کسی اور شاعر نے اٹھایا ہو۔ اسی برکت سے اقبال کی مقبولیت ساری علمی دنیا میں مسلمہ ہے۔ انسانوں سے اللہ تعالی فرماتا ہے کہ ہماری کتاب میں تدبر سے کام لو اس میں تمہارا ہی ذکر ہے ۔ ظاہر ہے انسان ہر قسم کے ہیں ۔ کافر، منافق اور مومن ۔ یہ خاص اصطلاحات قرآن کی پہلی سورت سے آخری سورت تک دیکھی جاسکتی ہیں ۔

میں یہاں قدرے جسارت سے کام لے کر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ کلام اللہ معجزہ ہونے کی وجہ سے اللہ نے عرب کے ان دعویدارانِ زبان و ادب کو چیلنج کیا تھا، للکارا تھا کہ اگر دم ہو تو ایسی کوئی سورت بنا لاؤ پھر اس چیلنج میں اور کمی کر کے فرمایا کہ چلو ایک سورت نہ سہی ایک آیت ہی ایسی کہہ کر تو دکھا دو بلکہ اپنے سارے مدعیان سخن کو جمع کر لو اور کوشش کرلو ۔ یہ چیلنج تا قیامت برقرار رہے گا ہمارا ناچیز خیال ہے کہ اقبال کا فکر و فن چونکہ اسی کلام زبانی سے مستنیر ہے تو اقبال بھی بفیض الٰہی اس منصبِ عالی پر متمکن دکھائی دیتے ہیں کہ ان کی طرح کی ایک نظم یا غزل یا قطعہ کہنا بھی نام نہاد امامانِ فکر و فن کے لیے ہمیشہ سے چیلنج رہا ہے ۔

اسی سلسلے میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ تمام کلام مجید کے سی پاروں میں دنیا و آخرت کا ہر موضوع تفصیل سے بیان ہوا ہے لیکن تیسویں پارۂ عم کی چھوٹی چھوٹی سورتیں بظاہر مختصر دکھائی دیتی ہیں مگر تین تین، چار چار آیات پر مشتمل سورتوں میں ایمانیات و اسلامیات کی

ایک دنیا رکھ دی گئی ہے۔مثال کے طور پر سورۃ العصر،سورۃ الکوثر، سورۃ النصر،سورۃ القدر وغیرہ۔سورۃ العصر کے بارے میں امام شافعیؒ نے فرمایا کہ اگر پورا کلام مجید نہ بھی نازل ہوا ہوتا تو صرف یہ مختصر سی سورت انسان کی فلاح وصلاح کے لیے کافی ہو جاتی۔صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایک دوسرے سے مل کر جدا ہوتے تو یہ سورت سنا کر جدا ہوتے۔

والعصر۔ ان الانسان لفی خسر ۔الا الذین آمنوو عملوالصلحتِ و تواصوا بالحقِ و تواصو ابالصبر ۔

ترجمہ: زمانے کی قسم۔انسان درحقیقت بڑے خسارے میں ہے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔(تفہیم القرآن۔جلد ششم)

اس کی تفسیر میں مفسرین نے بہت کچھ لکھا ہے۔ہمارے عصر کے ایک بہت بڑے مفکر و مقررِ عالم بے بدل ڈاکٹر اسرار احمد نے اپنی تنظیم کی بنیاد اسی سورت پر قائم کی۔ ان کا مرتبہ ''منتخب نصاب'' اسی اجمال کی تفصیل ہے۔یہی حال پارۂ عم کی دیگر مختصر مختصر سورتوں کا ہے۔رسول اکرم ﷺ کے صاحب زادے ابراہیم کا جب انتقال ہوا تو ابوجہل وابولہب نے کہنا شروع کیا تھا کہ اب رسول اللہ ﷺ کی نسل کا خاتمہ ہو گیا۔اس پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے سورہ کوثر نازل فرما کر تسلی دی کہ دنیا میں مردوں میں سے کسی کے باپ نہ ہونے کے باوجود آپ کا نام نامی اسم گرامی تو قیامت تک آنے والے آپ کے روحانی بیٹوں کے ذریعے آپ کی شان روشن کرتا رہے گا جب کہ آپ پر طنز کرنے والے ہی بے نام ونشان ہو کر رہ جائیں گے۔اور یہ کہ حوضِ کوثر پر تشریف فرما ہو کر آپ ﷺ اپنے جاں نثاروں کو جامِ کوثر سے سیراب فرمائیں گے۔یہ فضیلت کسی اور کو حاصل نہ رہے گی۔آپ ﷺ سے کہا گیا

کہ شکرانے کے طور پر آپ ﷺ سجدہ ریز ہو جائیں اور قربانی دیں۔ دیکھئے تین آیات کی اس مختصر ترین سورۃ الکوثر میں کیا کیا فرما دیا گیا ہے۔

علامہ اقبال نے بھی اسی طرح قرآنی اسلوب Diction کی پیروی کرتے ہوئے اپنے تمام فکر و فلسفہ کا نچوڑ اپنی کتاب ضربِ کلیم کی مختصر مختصر تخلیقات میں پیش کرنے کی ایماندارانہ کوشش کی ہے۔ بانگِ درا اور بال جبریل کی طویل نظموں، غزلوں میں جو کچھ کہا تھا اس کو اقبال نے جوہر فکر Essense کی طرح ضربِ کلیم میں پیش کیا ہے۔ تین اشعار کے ذریعے ضربِ کلیم کی ابتدا ہی میں اقبال ناظرین کو للکارتے ہیں:

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر
تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریفِ سنگ
یہ زورِ دست و ضربتِ کاری کا ہے مقام
میدانِ جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ
خونِ دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات
فطرت لہو ترنگ ہے غافل، نہ جل ترنگ

زندگی کے سنگین حقائق پر نظر رکھنے والا کانچ کا پیراہن زیبِ تن نہیں کرتا۔ میدان جنگ میں چنگ و رباب کا کیا کام؟ یہاں تو زورِ بازو سے کام لیتے ہوئے باطل پر کاری ضرب لگانے کی ضرورت ہے۔ دل و جگر میں اگر خون رواں دواں ہے تو یہی سرمایۂ حیات ہے کہ فطرت لہو کے ترنگ کی تمنائی ہے جل دھارا کی نہیں۔ دیکھئے صرف تین شعروں میں اقبال نے مرد مومن کو کیا بننا ہے اور کیا نہیں ہونا ہے کی پوری تعلیم دے دی ہے۔

ترا گناہ ہے اقبال مجلس آرائی اگر چہ تو ہے مثال زمانہ کم پیوند
جو کو گنار کے خوگر تھے ان غریبوں کو تری نوا نے دیا ذوق جذبہ ہائے بلند

زمانے میں انقلابات تو آتے ہی رہتے ہیں مگر اقبال اپنے دو شعروں میں مرد مومن کا تعارف ضرب کلیم کی ابتدا میں کچھ اس طرح کراتے ہیں:

یہ سحر جو کبھی فردا ہے کبھی ہے امروز نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا
وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستان وجود ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

ناچیز رؤف خیر کا ایک شعر ہے:

ہمارا کفر بھی ایمان کا تقاضہ ہے اسی لیے تو کہا لا الہ الا اللہ

پہلے تمام معبودانِ باطل سے ہاتھ اٹھانا ہے، تب الا اللہ کی منزل آتی ہے۔ اقبال اسی فکر کو پیش کرتے ہوئے فرق باطل پر ضربِ شدید لگاتے ہوئے فرماتے ہیں۔

خودی کا سرّ نہاں لا الہ الا اللہ خودی ہے تیغ فساں لا الہ الا اللہ
یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے صنم کدہ ہے جہاں لا الہ الا اللہ
کیا ہے تو نے متاعِ غرور کا سودا فریبِ سود زیاں لا الہ الا اللہ

''متاع غرور'' خالص قرآن کی اصطلاح ہے جس سے اقبال نے فیض اٹھایا ہے۔

یہ مال و دولتِ دنیا، یہ رشتہ و پیوند بتانِ وہم و گماں لا الہ الا اللہ

یہاں پھر اقبال قرآنی اسلوب سے استفادہ کرتے ہیں کہ قرآن کہتا ہے آل اولاد و مال و متاع تمہارے لیے فتنہ ہیں انما الاموالکم و اولادکم فتنہ (التغابن:۱۵)

خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زنّاری نہ ہے زماں نہ مکاں لا الہ الا اللہ
یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند بہار ہو کہ خزاں لا الہ الا اللہ

مومن کے لیے فائدے ہی فائدے ہیں اگر اللہ سرفراز فرماتا ہے تو شکر بجالاتا ہے اور اگر آزماتا ہے تو صبر و استقامت سے کام لیتا ہے۔ دونوں حالات میں اللہ سے جڑا رہتا ہے۔ روگردانی نہیں کرتا۔

اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں مجھے ہے حکمِ اذاں لا الہ الا اللہ

''تن بہ تقدیر'' مسلمانوں کو اقبال جھنجھوڑتے ہوئے غیرت دلاتے ہیں:

تن بہ تقدیر ہے آج ان کے عمل کا انداز
تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر
تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

قرآن کہتا ہے۔لیس لا الانسان الا ماسعی۔
(انسان کے لیے وہی ہے جو اس نے کمایا)

''اجتہاد'' کے نام پر جو دھاندلیاں نام نہاد مسلمانوں کے بکاؤ مفتی کیا کرتے ہیں ان پر اقبال ضرب لگاتے ہیں:

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

ایسے ہی دو رکعت کے اماموں پر اقبال کا طنز بڑا کاری ہے

قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے
اس کو کیا سمجھیں یہ بے چارے دو رکعت کے امام

ایسے ہی ملاؤں سے اقبال نالاں ہیں اور انھیں ہدفِ ملامت بناتے رہتے ہیں۔

عجب نہیں کہ خدا تک تری رسائی ہو
تری نگہ سے ہے پوشیدہ آدمی کا مقام
تری نماز میں باقی جلال ہے نہ جمال
تری اذاں میں نہیں ہے مری سحر کا پیام

(مُلّائے حرم)

ایک اور جگہ اقبال احساس دلاتے ہیں:

زمانہ ایک حیات ایک کائنات بھی ایک
دلیل کم نظری قصہء جدید و قدیم

بے کردار ہندی مسلمانوں کی عبرت خیز صورتِ حال کا جو نقشہ اقبال نے برسوں پہلے کھینچا تھا آج کے دور کے مسلمان پر بھی صادق آتا ہے۔

غدّارِ وطن اس کو بتاتے ہیں برہمن　　　انگریز سمجھتا ہے مسلماں کو گداگر

اسی لیے اقبال دو شعروں میں ''حیاتِ ابدی'' کا نسخہ بتاتے ہیں:

زندگانی ہے صدف قطرۂ نیساں ہے خودی
وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گہر کر نہ سکے
ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

''تصوف'' کے نام پر جو بے عملی کی تعلیم دی جاتی ہے اس پر اقبال کی چوٹ ملاحظہ کیجیے: (تصوف)

یہ ذکرِ نیم شبی یہ مراقبے یہ سرور　　　تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں
خرد نے کہہ بھی دیا لاالہ تو کیا حاصل　　　دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

علامہ اقبال توحیدرو خالد وعمرؓ جیسے اسلاف کے ایمان و اسلام کے قائل ہیں وہ ''ہندی اسلام'' کو درخورِ اعتنا ہی نہیں سمجھتے جو فرقوں میں بٹا ہوا ہے۔

ہے زندہ فقط وحدتِ افکار سے ملت
وحدت ہو فنا جس سے وہ الہام بھی الحاد
وحدت کی حفاظت نہیں بے قوتِ بازو
آتی نہیں کچھ کام یہاں عقلِ خدا داد
اے مردِ خدا تجھ کو وہ قوت نہیں حاصل
جا بیٹھ کسی غار میں اللہ کو کر یاد
مسکینی و محکومی و نومیدیِ جاوید
جس کا یہ تصوف ہو وہ اسلام کر ایجاد
ملّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

ملّت جب وحدت نا آشنا ہو جاتی ہے تو مسکینی و محکومی و نومیدی جاوید اس کا مقدر ہو جاتی ہے۔ ایسے ہی راہبانہ بود و باش اختیار کرنے والوں پر اقبال غم و غصہ کا اظہار کرتے ہیں۔ کچھ شدت پسند تو ایسے بھی ہیں جو خدا بیزار بھی ہیں۔ ان سے اقبال مخاطب ہیں:

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

ضرب کلیم میں اقبال نے بہت جامع طرز بیان اختیار کیا ہے جو دراصل پارۂ عم کے قرآنی نہج سے استفادہ پر مشتمل ہے:

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

رسول اللہ ﷺ کے اصحاب کے تعارف میں قرآن کہتا ہے: اَشِدّاء علی الکفار و رحماء بینھم

اسی بات کو اقبال نے دل نشیں شعر میں ڈھال دیا ہے

ہو حلقہء یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

''ضربِ کلیم'' میں مختلف عنوانات کے تحت فکر انگیز جامع نظمیں ہیں مگر صرف چار غزلیں پائی جاتی ہیں جن کے اشعار مربوط و مسلسل فکر پر مبنی ہیں۔ پہلی غزل میں اقبال نام نہاد مسلمان سے مکالمہ کرتے نظر آتے ہیں:

تیری متاع حیات علم و ہنر کا سرور
میری متاع حیات ایک دلِ ناصبور
معجزہَ اہل فکر فلسفہء پیچ پیچ
معجزہَ اہلِ ذکر موسی و فرعون و طور
مصلحتاً کہہ دیا میں نے مسلماں تجھے
تیرے نفس میں نہیں گرمیِ یوم النشور
ایک زمانے سے ہے چاک گریباں مرا
تو ہے ابھی ہوش میں، میرے جنوں کا قصور!

فیضِ نظر کے لیے ضبطِ سخن چاہیے
حرفِ پریشاں نہ کہہ اہلِ نظر کے حضور
خوار جہاں میں کبھی ہو نہیں سکتی وہ قوم
عشق ہو جس کا جسور، فقر ہو جس کا غیور

اس طرح اقبال قوم کو ایک رہنمایانہ اصول دے رہے ہیں کہ جسارت و جرأت مند عشق اور غیرت مند فقر والی قوم کبھی ذلیل و خوار نہیں ہو سکتی۔

جرأت ہو نمو کی تو فضا تنگ نہیں ہے
اے مردِ خدا ملکِ خدا تنگ نہیں ہے

اقبال کو اندازہ ہے کہ ان کی بات پہنچ نہیں پا رہی ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں:

بیاں میں نکتہء توحید آتو سکتا ہے
ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے

ضرب کلیم کا خاص موضوع انسان، وہ بھی مرد مسلمان ہے۔ بار بار اس سے مخاطب ہو کر اقبال اس کی کردار سازی کرتے ہیں تا کہ وہ بھیڑ میں گم ہو کر نہ رہ جائے

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان
فطرت کا سرودِ ازلی اس کے شب و روز
آہنگ میں یکتا صفتِ سورۂ رحمٰن
بنتے ہیں مری کارِ گہ فکر میں انجم
لے اپنے مقدر کے ستارے کو تو پہچان

اقبال بجائے خود پنجابی ہوتے ہوئے بھی پنجابی مسلمان کی مذہب میں جدت پسندی کو نشانہ بناتے ہیں۔ مخفی مباد کہ قادیان بھی پنجاب ہی میں واقع ہوا ہے۔

مذہب میں بہت تازہ پسند اس کی طبیعت
کرلے کہیں منزل تو گزرتا ہے بہت جلد
تحقیق کی بازی ہو تو شرکت نہیں کرتا
ہو کھیل مریدی کا تو ہرتا ہے بہت جلد
تاویل کا پھندہ کوئی صیاد لگادے
یہ شاخ نشیمن سے اترتا ہے بہت جلد

اس میں پنجاب کی کوئی قید نہیں ہے شمال سے دکن تک قرآنی احکام کی من مانی تاویلات کے ذریعے سادہ لوح مسلمانوں کو لوٹنے کا سلسلہ دراز ہے۔ اقبال زبان کے تخلیقی استعمال سے بھی خوب چونکاتے ہیں یہاں ''تازہ پسند'' اور ''ہرتا'' کا استعمال مزہ دے رہا ہے۔ جو مسلمان ''تازہ پسندی'' کا شکار ہو جاتا ہے اسے:

ہے کس کی یہ جرأت کہ مسلمان کو ٹوکے
حُریّتِ افکار کی نعمت ہے خداداد
چاہے تو کرے کعبے کو آتش کدۂ پارس
چاہے تو کرے اس میں فرنگی صنم آباد
قرآن کو بازیچۂ تاویل بنا کر
چاہے تو خود اک تازہ شریعت کرے ایجاد
ہے مملکت ہند میں اک طرفہ تماشا
اسلام ہے محبوس، مسلمان ہے آزاد

(آزادی)

مگر اقبال آگے اپنا فیصلہ بھی سنا دیتے ہیں:

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات مومن فقط احکام الٰہی کا ہے پابند

ایسے ہی مردِ مومن کا ''موت'' بھی کچھ بگاڑ نہیں سکتی۔ اقبال کہتے ہیں:

لحد میں بھی یہی غیب و حضور رہتا ہے
اگر ہو زندہ تو دل نا صبور رہتا ہے
مہ و ستارہ مثالِ شرارہ یک دو نفس
مئے خودی کا ابد تک سرور رہتا ہے
فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا
ترے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے

(موت)

غزل کا فارم یوں بھی ایجاز میں اعجاز کا فن ہے اور اقبال نے اس فن کو معراج تک پہنچا دیا ہے: ضربِ کلیم عجز بیانی نہیں بلکہ معجز بیانی سے بھری ہوئی ہے۔

اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی
ہو جس کے جوانوں کی خودی صورتِ فولاد
شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا
پُر دم ہے اگر تو تو نہیں خطرۂ افتاد

کیوں کہ جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے۔

شیرِ میسور ٹیپو سلطان علامہ اقبال کا آئیڈیل (مثالی کردار) ہے۔ مردِ مومن کے لیے اقبال نے اپنے دل کی آواز کو "سلطان ٹیپو کی وصیت" کے روپ میں پیش کیا ہے:

تو رہ نوردِ شوق ہے منزل نہ کر قبول
لیلی بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول
اے جوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز
ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول
کھویا نہ جا صنم کدۂ کائنات میں
محفل گداز ۔گرمیِ محفل نہ کر قبول
صبح ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے
جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول
باطل دوئی پسند ہے، حق لاشریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

اقبال حق و باطل میں سے باطل کو رد کرتے ہوئے صرف اور صرف حق اختیار کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ مصلحت و مصالحت اسلام کی گھٹی ہی میں نہیں ہے۔ اسلام میں یا تو Yes ہے یا پھر NO ہے ورنہ ''تامرون بالمعروف وتنہا عن المنکر'' کا مطلب ہی کیا رہ جاتا۔ قرآن ایک، صراطِ مستقیم ایک، اسوۂ حسنہ ایک۔ چوراہے کبھی منزل تک نہیں پہنچاتے یہی سبب ہے کہ ''آزادی افکار'' کے نام پر کھلی چھوٹ گمراہی کا شاخسانہ ہوتی ہے۔

آزادی افکار سے ہے ان کی تباہی   رکھتے نہیں جو فکر و تدبر کا سلیقہ
ہو فکر اگر خام تو آزادیِ افکار   انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ

اقبال مردِ مومن کو ''ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر فردا'' دیکھنا نہیں چاہتے بلکہ اسے متحرک وفعال دیکھنا چاہتے ہیں:

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کردے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں
تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں

طوطا مینا کی طرح رٹنے سے کیا ہوتا ہے۔ اقبال تو کتاب کو اس طرح پڑھنے کی ترغیب دیتے ہیں گویا کتاب کا نزول پڑھنے والے ہی کے دل پر ہورہا ہو۔ یہ ایسی کتاب ہے جسے آنکھوں سے نہیں دل سے پڑھنے کی ضرورت ہے تب جا کر کتاب کا حق ادا ہوگا اور پڑھنے والے کو فائدہ بھی ہوگا۔ یہ کلام پڑھ کر مُردوں کو بخشوانا نہیں ہے بلکہ یہ زندہ دلوں کی تربیت ہی کے لیے اتارا گیا ہے۔ اقبال کے بارے میں آیا ہے کہ ان کے زیر مطالعہ رہنے والا مصحف ان کے آنسوؤں میں بھیگ بھیگ جاتا تھا۔ تبھی تو اقبال کے کلام میں قرآنی

اسلوب ہر شعر سے بولتا دکھائی دیتا ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا ہے ضرب کلیم مختصر ترین نظموں پر مشتمل ہے غزلیں بس دو چار ہی ہیں، ضربِ کلیم کی غزلیں بھی نظم ہی کی طرح مختصر مگر فکر کی گہرائی و گیرائی سے بھرپور ہیں۔ دوسری غزل کے دو شعر دیکھئے:

ملے گا منزلِ مقصود کا اسی کو سراغ
اندھیری شب میں ہے چیتے کی آنکھ جس کا چراغ
میسر آتی ہے فرصت فقط غلاموں کو
نہیں ہے بندۂ حر کے لیے جہاں میں فراغ

افسوس کہ ہمارے جوانوں کو فرصت ہی فرصت فراغت ہی فراغت حاصل ہے۔ وہ راتوں میں دیر تک کسی صراطِ غیر مستقیم (پُل) پر یا چبوتروں پر گھنٹوں گپ بازی میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔ اپنے گھر کے دروازے کے بالکل سامنے مسجد کا گیٹ ہوتا ہے اس کے باوجود اللہ کا بندہ مسجد میں کبھی قدم نہیں رکھتا۔ ایسے ہی آزاد بندوں کو غیرت دلاتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ میسر آتی ہے فرصت فقط غلاموں کو۔ ورنہ بقول اقبال: ہزار کام ہیں مردانِ حُر کو دنیا میں۔

ہمارا ایک مصرع ہے: مومن کے لیے کوئی تعطیل نہیں ہوتی۔ (خیر)

یہاں تو ایک ایک پل بڑا قیمتی ہے۔ یہ پل پھر لوٹ کر آنے والا نہیں ہے۔ اقبال نوجوانوں کو رہبانیت اور گوشہ نشینی کی تعلیم نہیں دیتے بلکہ زمانے سے آنکھ ملانا سکھاتے ہیں:

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

اسی لیے اقبال، صاحب نظر بننے کا نوجوان کو مشورہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شئے کی حقیقت کو نہ سمجھے وہ نظر کیا
جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا
اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنّی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں
جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

اقبال مردِ مسلماں کو مصروفِ تگ ودو دیکھنا چاہتے ہیں۔ بے کار و مضمحل نہیں دیکھنا چاہتے۔

ایسی کوئی دنیا نہیں افلاک کے نیچے
بے معرکہ ہاتھ آئے جہاں تختِ جم وکے
ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلّی
اللہ کرے مرحلہء شوق نہ ہو طے

ایک اور جگہ اقبال مردِ مسلماں کو احساس دلاتے ہیں کہ کوئی چیز یوں ہی حاصل نہیں ہو جاتی:

خون رگِ معمار کی گرمی سے ہے تعمیر — مے خانہء حافظ ہو کہ بت خانہء بہزاد
بے محنتِ پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا — روشن شررِ تیشہ سے ہے خانہء فرہاد

مختصر یہ کہ ضربِ کلیم میں اقبال مردانِ مجاہد کے سالار نظر آتے ہیں۔

☆☆☆

گوئٹے اور اقبال

اقبال اردو اور فارسی شاعر کا ایک ہمالہ ہے۔ میں تو اقبال کا یک ادنیٰ طالب علم ہوں اور ایک معمولی گلہری کی طرح چھالیہ توڑ کر دکھا رہا ہوں۔

کہاں اقبال کی ترجمانی کی جسارت اور کہاں میں! اور پھر میں کیا میری فارسی دانی کیا! لیکن جو کچھ مجھ سے ہوسکا ہے سب مع فارسی متن آپ کے سامنے ہے۔ میں نے اقبال ہی کی بحر اور اسلوب میں یہ ترجمہ کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

بعض فارسی داں حضرات نے ان تراجم کی داد دے کر میرے حوصلے بڑھائے بعض نے میری کم علمی کا مذاق بھی اڑایا کہ اتنی کم استعداد پر چلے ہیں فارسی سے اردو میں منظوم ترجمہ کرنے! مجھے اپنی کم مائیگی کا پورا پورا احساس ہے اس کے باوجود میں نے یہ جو ''لالہء طور'' کے عنوان کے تحت ''پیامِ مشرق'' میں شامل علامہ اقبال کی رباعیات کا منظوم ترجمہ کردیا ہے وہ اربابِ نظر کی نذر ہے۔

گوئٹے کا دیوان مغرب (West Ostlicher Divan) ۱۸۱۹ء میں شائع ہوا جس کے جواب میں علامہ اقبال کا ''پیامِ مشرق'' تقریباً سو ۱۰۰ برس بعد عالم وجود میں آیا۔ اپنے مجموعے کے سرنامے کے طور پر اقبال "للہ المشرق و المغرب" لکھ کر گویا یہ ثابت کیا کہ مشرق و مغرب کی فرمانروائی الہ واحد ہی کا حق ہے جو زبان و مکاں کی قید سے ماوراء ہے۔

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ کہیں گوئٹے کی وجہ سے اقبال زیر بحث ہیں تو کہیں اقبال کی وجہ سے گوئٹے کے فکر وفن کا جائزہ لیا جارہا ہے۔فلسفہ،تنقید،شعریات اور تہذیب کا یہ ایک زندہ موضوع بن گیا ہے۔ڈاکٹر اکرام چغتائی نے اس موضوع پر دنیا بھر کی مختلف زبانوں میں شائع ہونے والی لگ بھگ تین سو کتابوں کی فہرست شائع کی ہے۔

ڈاکٹر آرتھر ریمی Dr. Arthur Remy نے اپنی کتاب "The Influence of India & Persia on the Poetry of Germany" میں تفصیل سے جرمنی کے دیگر شعراء کے ساتھ ساتھ گوئٹے پر بھی ان اثرات کی مدلل نشاندہی کی ہے۔گوئٹے جہاں ویدانتی فلسفے اور تہذیب کو سنسکرت کے جرمن ترجموں کے حوالے سے پڑھ چکا تھا وہیں قرآن مجید کے جرمن ترجمے بھی اس کے پیش نظر تھے۔ساتھ ہی ساتھ رسول اکرم ﷺ کی سیرت پر بھی اس کی گہری نظر تھی۔وہ کلام اللہ اور سیرت رسول اللہ سے اس قدر متاثر تھا کہ اس نے اپنی اک نظم کا آغاز ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کے الفاظ سے کیا۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ گوئٹے عربی رسم الخط سے بھی واقف تھا۔پاکستان کے مشہور وممتاز محقق نقاد و ماہر اقبالیات ڈاکٹر اکرام چغتائی نے اپنی کتاب (بزبان انگریزی) Iqbal and Goethe (سنہ اشاعت ۲۰۰۰ء) میں گوئٹے کی وہ جرمن نظم اسی کے سواد خط میں چھاپ دی جس پر خود گوئٹے نے اپنے ہاتھ سے عربی میں ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' لکھا تھا۔اسلام سے گوئٹے کی رغبت ہی اقبال کو اس سے قریب کر گئی۔

گوئٹے فارسی زبان سے بھی کما حقہ،واقف تھا۔چنانچہ جدید تحقیقات کی روشنی میں یہ ثابت ہو چکا ہے کہ حافظ،سعدی،عمر خیام وغیرہ کو گوئٹے نے راست فارسی ہی میں پڑھا تھا۔اس کی فارسی دانی کا بین ثبوت اس کا ''دیوان مغربی'' ہے جو بارہ ابواب پر مشتمل ہے

اور حافظ کی پیروی میں ہر باب کا عنوان اس نے فارسی میں رکھا تھا جیسے ساقی نامہ، مغنی نامہ حکمت نامہ، تیمور نامہ، فارسی نامہ وغیرہ وغیرہ۔ گوئٹے بلا تکلف کئی فارسی تراکیب اپنی شاعری میں برتتا رہا جس کی طرف خود اقبال نے ''پیام مشرق'' کے پیش لفظ میں اشارہ کیا ہے۔

گوئٹے کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ''پیام مشرق'' کو علامہ اقبال نے چار حصوں میں تقسیم کیا ہے (اگر ابتدائیہ ''پیش کش'' اور اختتامیہ متفرقات ''خردہ'' کو الگ الگ باب شمار کیا جائے تو چھے حصے)۔ ''پیام مشرق'' کا ایک بڑا حصہ ''لالہ ءطور ہے جو ۱۶۳ قطعات پر پھیلا ہوا ہے۔ ناچیز نے اسی غالب حصے کا منظوم ترجمہ ''قنطار'' کے عنوان سے کرنے کی جسارت کی ہے۔ ''پیام مشرق'' میں شامل اک نظم ''تنہائی'' اور ''زبور عجم'' کی افتتاحہ دعا کا ترجمہ محض کتاب کی زینت بڑھانے کی نیت سے کیا گیا ہے کہ یہ دونوں تخلیقات بھی اقبال کی فکر خاص کا شناس نامہ ہیں۔

''لالہ ءطور'' کے قطعات عالمی ادب میں اقبال کی زندگی ہی سے مرکز نگاہ بن گئے تھے اقبال کے خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ اقبال کے معاصر جرمن نقادوں نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور ان پر تبصرے بھی کیے۔ انگریزی میں ڈاکٹر نکلسن اور ڈاکٹر آربری ''لالہ ءطور'' کے اولین مترجمین شمار کیے جاتے ہیں۔ اس کے بعد کئی ترجمے ہوئے۔ بشیر احمد ڈار، ممتاز حسین، سید عبدالواحد کے بعض انگریزی تراجم میری نظر سے گزر چکے ہیں۔ انا میری شمیل Annemarie Schimmel نے اپنی کتاب "Gabriel's Wing" میں لالہ ءطور کی رباعیات (قطعات) کی شرح کرتے ہوئے اقبال کے فکر و فن پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کی شاعری میں لالہ ءطور کی بڑی اہمیت ہے۔

کئی مستند نقاد اقبال کے فکروفن پر گفتگو کرتے ہوئے "لالہءطور" سے صرف نظر نہیں کر پاتے۔اردو میں فیض احمد فیض سے لے کرنا چیز رؤف خیر تک کئی شاعروں نے ان قطعات کا ترجمہ کیا ہے۔فکر ہر کس بہ قدر ہمتِ اوست۔ان تراجم کا تقابلی جائزہ اربابِ ذوق کو مزہ دے سکتا ہے۔انگریزی تراجم کے سلسلے میں اقبال کے صرف ایک قطعے کی مثال میں پیش کرنا چاہوں گا۔

چہ گویم نکتہ زشت ونکو چیست زباں لرزد کہ معنی پیچدار است
بروں از شاخ بینی خارو گل را درونِ او نہ گل پیدا نہ خاراست

بشیر احمد ڈار نے اس کا ترجمہ کیا ہے:

What should I say about good and evil
I trumled to express as the problem is knitty
you see the flower and the thorn outside the twig
while within it there is nothing of the two.

(Page-228 Iqbal and Goethe written by M. Ikram Chughtai-2000 A.D)

مذکورہ کتاب میں جناب سید عبدالواحد (Iqbal Arts & Philosophy کے مصنف) نے اس کا ترجمہ کچھ یوں کیا:

How should I describe good and evil ?
The problem is so complex that the tongue falters
Outside the bough you see flower and the thorn
Inside it there is neither flower nor thorn.

دونوں مترجموں کے تراجم لفظی اعتبار سے ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہیں لیکن دونوں نے اقبال کی صحیح ترجمانی کی پوری پوری کوشش کی ہے البتہ ادبی چاشنی کا جہاں تک سوال ہے ارباب نظر جانتے ہیں کہ کس کا ترجمہ بہتر ہے۔ بہ ہر حال یہ سلسلہ تو چلتا رہے گا۔ (ہمارے علم میں یہ بات بھی آئی ہے کہ ڈاکٹر عصمت جاوید نے لالہء طور کا انگریزی ترجمہ کر رکھا ہے جو اشاعت کا منتظر ہے۔ اس سے پہلے وہ ''اسرار خودی'' اور ''رموز بے خودی'' کا منظوم اردو ترجمہ کر چکے ہیں۔)

ترجمہ کرتے ہوئے میں نے اقبال کی فکر کو اقبال ہی کے اسلوب میں بیان کرنے کی حتی المقدور کوشش کی ہے۔ البتہ کہیں کہیں مصرعوں کو موخر و مقدم کرلیا ہے تاکہ ترجمے کا حسن مجروح نہ ہونے پائے۔ کہیں کہیں تو ایسے ایسے قافیے میں نے برتے ہیں اور کچھ ایسے الفاظ Coin کیے ہیں کہ سخن شناس اپنا سکوت توڑنے پر مجبور ہو ہی جائیں گے۔

بعض مشاق مترجموں کے کیے ہوئے ''لالہء طور'' کے تراجم میرے سامنے ہیں۔ ان کی شخصیت اور علمیت کا میں معترف ضرور ہوں لیکن ان کی موجودگی میں میرا یہ ترجمہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ میں ان کے ترجموں سے مطمئن اور متفق نہیں ہوں۔ ترقی اور کمال کی خواہش جس طرح انسانی فطرت میں موجود ہے اسی طرح انسانی تخلیقی شاہ کاروں میں بھی اس کا جواز موجود ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ان ترجموں میں مزید ترقی کی گنجائش نہیں ہے لیکن تابہ حدِ حدودِ خیر میں یہ کہہ سکتا ہوں۔

بے محنتِ پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا
روشن شررِ تیشہ سے ہے خانہء فرہاد

خونِ رگِ معمار کی گرمی سے ہے تعمیر
مے خانہ ء حافظ ہو کہ بت خانہ ء بہزاد

میں نے حتی الوسع اپنے علم شعر، لسانی تجربات اور تخلیقی اظہار کی صلاحیت کو پورے شعور کے ساتھ استعمال کرنے کی کوشش کی ہے تا کہ ان تراجم کو بہتر سے بہتر روپ دے سکوں۔

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کار مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

(علامہ اقبال کے ۱۶۳۔قطعات پر مشتمل لالہ ءطور (پیامِ مشرق) کا منظوم اردو ترجمہ ''قنطار'' کے نام سے ۲۰۰۱ء میں شائع ہو چکا ہے)

یہاں چند ''لالہ ءطور'' قطعات کا منظوم ترجمہ پیش کیا جاتا ہے:

شہیدِ نازِ او بزمِ وجود است
نیاز اندر نہادِ ہست و بود است
نمی بینی کہ از مہر فلک تاب
بسیمائے سحر داغِ سجود است

شہیدِ ناز اس کی بزم ہستی
اطاعت اس کی گھٹی میں پڑی ہے
افق پر تو نے کیا سورج نہ دیکھا
جبیں پر جیسے داغِ بندگی ہے

نوائے عشق را ساز است آدم
کشاید راز و خود راز است آدم
جہاں او آفرید، ایں خوب تر ساخت
مگر با ایزد انباز است آدم

ہے خود ہی ساز ،سر سنگھار آدم
ہے خود ہی راز خود اظہار آدم
کرے تخلیق پر حسن اضافی
ہے خالق کا شریک کار آدم

ز آب و گل خدا خوش پیکرے ساخت
جہانے از ارم زیبا ترے ساخت
ولے ساقی بآں آتش کہ دارد
زخاکِ من جہانِ دیگرے ساخت

بنایا رب نے خاکی خوب پیکر
جہاں ایسا ارم سے بھی حسین تر
کمال فن سے ساقی نے بنایا
مری مٹی سے اک آفاق دیگر

شنیدم در عدم پر وانہ می گفت
دمے از زندگی تاب و تبم بخش
پریشاں کن سحر خاکسترم را
و لیکن سوزو سازِ یک شبم بخش

سنا پروانہ کہتا تھا عدم میں
مجھے پل بھر حیاتِ تاب و تب دے
پریشاں کر گجردم خاک میری
مگر بھر پور سوز و سازِ شب دے

زیاں بینی زِ سیر بو ستانم
اگر جانت شہید جستجو نیست
نمایم آنچہ ہست اندر رگ گل
بہارِ من طلسم رنگ و بو نیست

گیا سیر چمن سے ہاتھ خالی
جو تجھ میں جستجو کی مد نہیں ہے
رگ گل میں ہے کیا کیا ۔کیا بتاؤں
طلسم رنگ و بو مقصد نہیں ہے

سکندر را با خضر خوش نکتہء گفت
شریکِ سوز و سازِ بحر و برشو
تو ایں جنگ از کنارِ عرصہ بینی
بمیر اندر نبرد و زندہ تر شو

سکندر نے کہا اچھا خضر سے
شریکِ سوز و سازِ بحر و بر ہو
کنارہ سے یہ کیا نظارہ کرنا
شہیدِ جنگ ہو کر زندہ تر ہو

میارا بزم بر ساحل کہ آں جا
نوائے زندگانی نرم خیزاست
بدریا غلط و باموجش درآویز
حیات جاوداں اندر ستیزاست

سجا محفل نہ ساحل پر کہ اس جا
نوائے زندگانی ہے سبک رو
اتر دریا میں لے موجوں سے لوہا
حیات جاوداں ہے یہ تگ و دو

مگو از مدعاے زندگانی
ترا بر شیوہ ہاے او نگہ نیست
من از ذوق سفر آنگو نہ مستم
کہ منزل پیش من جز سنگ رہ نیست

نہ کہہ کچھ مدعاے زندگی پر
اداؤں سے تو اس کی بے خبر ہے
میں ہوں ذوق سفر میں مست اتنا
مجھے منزل بھی سنگ رہ گزر ہے

وفا نا آشنا بیگانہ خو بود
نگاہش بے قرار جستجو بود
چو دیداو را پرید از سینہء من
ندانستم کہ دست آموز او بود

وفا نا آشنا بے گانہ خو تھا
کسی کی کھوج میں بے چین تھا دل
پر ندہ جیسے تھا اس کا سدھا یا
اسے دیکھا تو سینے سے اڑا دل

نما ید آنچہ ہست ایں وادی گل
درون لالہء آتش بجاں چیست ؟
بچشم ما چمن یک موج رنگ است
کہ می داند بچشم بلبلاں چیست ؟

ہے کیا آتش بجاں لالے کے اندر
یہ گل وادی حسیں بھی ہائے کیا ہے
ہمارے حق میں موج رنگِ گلشن
نہ جانے بلبلوں کی رائے کیا ہے ؟

دل من در طلسم خود اسیر است
جہاں از پر توِ او تاب گیر است
مپرس از صبح و شام از آفتابے
کہ پیش روزگار من پر یر است

گرفتار طلسم ذات ہے دل
ہے تزئینِ جہاں میں اس کا حصہ
مرے دن رات سورج سے نہ پوچھو
مرے آگے ہے وہ پرسوں کا قصہ

چہ گویم نکتہء زشت و نکو چیست
زباں لرزد کہ معنی پیچدار است
بروں از شاخ بینی خار و گل را
درونِ او نہ گل پیدا نہ خار است

کہوں کیا نیک و بد کا راز تجھ سے
لرزتی ہے زباں اس پیچ و خم سے
کھلے ہیں شاخ پر کانٹے بھی گل بھی
نہ گل ہیں شاخ کے اندر نہ کانٹے

تو می گوئی کہ آدم خاک زاد ست
اسیر عالم کون و فساد است
ولے فطرت زاعجازے کہ دارد
بنائے بحر بر جویش نہاد است

تو خود کہتا ہے خاکی ہے یہ آدم
اسیرِ یک جہانِ خیر و شر نا !
مگر فطرت کے اپنے معجزے سے
سمندر کی ہوا بنیاد جھرنا

دل بیباک را ضرغام ،رنگ است
دل تر سندہ را آہو پلنگ است
اگر بیمے نداری بحر صحراست
اگر ترسی بہر موجش نہنگ است

نڈر ہے دل تو ہے چیتا بھی بکری
ہے بزدل کے لیے آہو بھی چیتا
نڈر ہو تو تو ساگر بھی ہے صحرا
ہے ایک اک موج میں گھڑیا ل ورنہ

میان آب و گل خلوت گزیدم
ز افلاطون و فارابی بریدم
نہ کردم از کسے دریوزۂ چشم
جہاں را جز بچشم خود ندیدم

میں آب و گل میں تنہائی کا مارا
نہ افلاطوں نہ فارابی میں گم ہوں
کسی سے بھیک میں آنکھیں نہ مانگوں
خود اپنی آنکھ سے دنیا کو دیکھوں

مرنج از برہمن اے واعظِ شہر
گر از ما سجدۂ پیشِ بتاں خواست
خداے ما کہ خود صورت گری کرد
بتے را سجدۂ از قدسیاں خواست

برہمن سے خفا واعظ نہ ہونا
اگر وہ بت پرستی ہم سے چاہے
خدا نے خود بھی جب صورت گری کی
تو سجدایا تھا بت کو قدسیوں سے

تو می گوئی کہ من ہستم ، خدا نیست
جہان آب و گل را انتہا نیست
ہنوز ایں راز برمن ناکشوداست
کہ چشم آنچہ بیند ہست یا نیست

تو کہتا ہے ، ہوں میں ہی میں ، خدا نئیں
جہانِ آب و گل کی انتہا نئیں
کھلا اب تک نہ مجھ پر راز اتنا
جو دیکھا آنکھ نے وہ ہے بھی یا نئیں

رمیدی از خداوندانِ افرنگ
ولے بر گور و گنبد سجدہ پاشی
بہ لالائی چناں عادت گرفتی
زسنگِ راہ مولائے تراشی

خداوندانِ افرنگی سے بھاگا
تو سجدہ گور و گنبد کا تراشا
غلامی کی پڑی عادت کچھ ایسی
کہ ہر پتھر سے اک آقا تراشا

ترا اے تازہ پرواز آفریدند
سراپا لذتِ بال آزمائی
ہوس ما را گراں پرواز دارد
تو از ذوقِ پریدن پر کشائی

تری تخلیق ہی اے تازہ شہپر
اڑانوں کے لیے ہے اڑ ، مزہ لے
ہوس نے کی مری پرواز مشکل
مگر تو تو پروں کو آزما لے

''زبورِ عجم'' کی افتاحیہ دعا

یارب درونِ سینہ دل باخبر بدہ
در بادہ نشہ را نگرم آں نظر بدہ
ایں بندہ را کہ بانفس دیگراں نزیست
یک آہِ خانہ زاد ، مثالِ سحر بدہ
سیلم مرا بہ جوئے تنک مایہء مپیچ
جو لا نگہے بہ وادی و کوہ و کمر بدہ
سازی اگر حریفِ یمِ بے کراں مرا
بااضطراب موج سکونِ گہر بدہ
شاہین من بہ صید پلنگاں گذاشتی
ہمت بلند و چنگل ازیں تیز تر بدہ
رفتم کہ طائرانِ حرم راکنم شکار
تیرے کہ نافگندہ فتد کار گر بدہ
خاکم بہ نورِ نغمہء داؤد بر فروز
ہر ذرّہَ مرا پرو بالِ شرر بدہ

منظوم اردو ترجمہ

از

ڈاکٹر رؤف خیر

پہلو میں دل دیا ہے تو دل باخبر بھی دے
دیکھوں مزاجِ نشہء مئے وہ نظر بھی دے
سانسوں پہ دوسروں کی گزاروں نہ زندگی
یک آہِ خانہ زاد مثالِ سحر بھی دے
رکھیو نہ سیلِ فکر مرا جوہڑوں میں قید
میداں بھی اس کو وادی و کوہ و کمر بھی دے
جب بحرِ بے کراں کے مقابل کیا مجھے
پھر موجِ مضطرب کو سکونِ گہر بھی دے
شاہین کو بنایا شکاری جو شیر کا
ہمت بلند پنجے ذرا تیز تر بھی دے
جاتا ہوں طائرانِ حرم کے شکار کو
اب خوش نشان تیر مجھے کارگر بھی دے
چمکا دے نورِ نغمہء داؤد سے مجھے
میرے روئیں روئیں کو شرربار کر بھی دے

تنہائی
(پیام مشرق)

بہ بحر رفتم و گفتم بہ موجِ بے تابے
ہمیشہ در طلب استی چہ مشکلے داری؟
ہزار لولوئے لالاست در گریبانت
درونِ سینہ چومن گوہرِ دلے داری؟

تپید و از لبِ ساحل رمید و ہیچ نگفت

بہ کوہ رفتم و پرسیدم ایں چہ بیدر دیست
رسد بگوشِ تو آہ و فغانِ غم زدۂ ؟
اگر بہ سنگِ تو لعلے زقطرۂ خون است
یکے در آ بہ سخن بامن ستم زدۂ

بخود خزید و نفس در کشید و ہیچ نگفت

منظوم ترجمہ

از

ڈاکٹر رؤف خیر

گیا میں بحر پہ ، بے چین موج سے پوچھا
ہے تو سدا کی سوالی، ہے کیا پریشانی ؟
ہزار موتی ٹکے ہیں ترے گریباں میں
ہے میری طرح کا پہلو میں گوہرِ دل بھی؟

تڑپ کے بھاگی کنارے سے اور کچھ نہ کہا

گیا پہاڑ پہ، پوچھا یہ کیا ہے بیدردی
تو کان دھرتا نہیں غم زدوں کی آہ پہ کیوں؟
ستم زدوں سے بھی کچھ بول دو گھڑی کے لیے
اگر ہے پیکرِ سنگیں میں لعلِ قطرۂ خون

وہ دم بخود تھا کہ دیکھا بہ غور، اور کچھ نہ کہا

رہِ دراز بریدم زِ ماہ پر سیدم
سفر نصیب ! نصیبِ تو منزلے است کہ نیست؟
جہاں زِ پرتو سیمائے تو سمن زارے
فروغِ داغِ تو از جلوہَ دلے است کہ نیست ؟

سوے ستارہ رقیبانہ دید و ہیچ نگفت

شدم بہ حضرتِ یزداں گذشتم از مہ و مہر
کہ در جہانِ تو یک ذرہ آشنایم نیست
جہاں تہی زِ دل و مشتِ خاکِ من ہمہ دل
چمن خوش است و لے در خور نوایم نیست

تبسمے بہ لب او رسید و ہیچ نگفت

مسافتوں سے گزر کر یہ چاند سے پوچھا
سفر نصیب کو منزل نصیب ہے کہ نہیں؟
چمک جہاں میں ہے تیری جبیں کے پرتو سے
فروغِ داغ یہ دل سے قریب ہے کہ نہیں ؟

نظر کی تاروں پہ چشمک بطور، کچھ نہ کہا

جو مہر و ماہ سے گزرا ، حضورِ حق پوچھا
ترا جہاں تو ذرا مجھ کو جانتا ہی نہیں
ترا جہان ہے بے دل ، میں دل سراپا ہوں
چمن ہے ٹھیک مگر در خورِ نوا ہی نہیں

تو مسکرا دیا وہ خود بھی اور کچھ نہ کہا

طنز و ظرافتِ اقبال

انسان بجائے خود حیوانِ ناطق اور حیوانِ ظریف ہے۔ پڑھا لکھا ذہین آدمی اپنے ردعمل میں ایسی ذہانت سے کام لیتا ہے کہ مخاطب گنگ ہو کر رہ جاتا ہے۔ مرزا غالب کو خط میں کسی نے ماں کی گالی لکھ بھیجی تھی تو غالب نے لکھنے والے کی ذ ھـنـی بے مایگی کی کھلی اڑاتے ہوئے کہا کہ اس شخص کو تو گالی دینا تک نہیں آتا۔ ستّر بہتّر برس کے بوڑھے پر ماں کی گالی کا بھلا کیا اثر ہو سکتا ہے۔ پھر غالب نے کہا بچے کو ماں کی گالی دی جائے تو اُسے بُرا لگتا ہے کیوں کہ اسے اپنی ماں سے بہت محبت ہوتی ہے۔ نوجوان کو اگر بیوی کی گالی دی جائے تو وہ مرنے مارنے پر تل جاتا ہے کیوں کہ اُسے بیوی سے دلی لگاؤ ہوتا ہے اسی طرح بوڑھے کو بیٹی کی گالی دی جائے تو وہ بہت خفا ہو جاتا ہے کیوں کہ اسے بیٹی بہت عزیز ہوتی ہے۔ اس طرح غالب نے اس خط کو ہوا میں اڑا دیا جو اپنی جگہ بہت بڑا طنز ہے۔

طنز و مزاح میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ طنز میں مزاح کا عنصر شامل ہوتا ہے۔ اسی طرح مزاح میں طنز کی زیریں لہر پائی جاتی ہے۔ وہ لطیفہ بہت مشہور ہے کہ مرزا غالب بڑے شوق سے آم کھا رہے تھے چھلکے گلی میں پھینک رہے تھے۔ ان کے ساتھ ایک ایسے صاحب بیٹھے ہوئے تھے جنھیں آم پسند نہیں تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ گلی میں ایک گدھے نے آم کے چھلکے سونگھ کر چھوڑ دیے۔ اُن صاحب نے مرزا غالب سے طنزیہ انداز میں فرمایا کہ غالب صاحب دیکھئے! آم ایسی چیز ہے جسے گدھے بھی نہیں کھاتے۔ غالب نے مسکرا کر جواب دیا ”ہاں گدھے آم نہیں کھاتے“۔

ہر ذہین آدمی کا ردعمل بہت بھرپور ہوتا ہے۔ وہ خود بھی جب کوئی طنز کرتا ہے تو وہ بھی چونکانے والا ہوتا ہے۔ عموماً بے تکلف دوستوں میں دل چسپ چوٹیں چلتی ہی رہتی ہیں جو دل آزاری کی نیت سے نہیں کی جاتیں۔

اندھیری رات میں ایک دوست کو وداع کرنے کے لیے مرزا غالب لالٹین لے کر دروازے تک گئے تو ان کے دوست نے کہا غالب صاحب اتنی زحمت کی ضرورت نہ تھی میں اپنا جوتا ڈھونڈ کر پہن ہی لیتا۔ غالب نے کہا کہ روشنی دکھانے کا مطلب یہ ہے کہ کہیں آپ میرا جوتا پہن کر نہ چلے جائیں۔ یہ بے تکلفی دل لبھاتی ہے۔

علامہ اقبال بھی ذہانت میں کسی سے کم نہ تھے۔ ان کی علمیت کی وجہ سے لوگ اُن سے مرعوب رہا کرتے تھے مگر وہ اپنے بے تکلف دوستوں پر خوب جملے کستے تھے۔ خاص طور پر چودھری سر شہاب الدین ان کی زد میں آتے تھے جو کالے کلوٹے تھے۔ انھوں نے سیاہ سوٹ زیب تن کر رکھا تھا تو اقبال نے چوٹ کی ''ایسا لگتا ہے آپ ننگے ہی چلے آئے'' اور جب انھوں نے سفید لباس پہنا تو اقبال نے فرمایا ایسا محسوس ہوتا ہے کپاس کے کھیت میں ارنا بھینسا گھس آیا ہے۔ یہی کالے کلوٹے چودھری شہاب الدین نے بڑی عالی شان کوٹھی تعمیر کی اور اقبال سے گزارش کی کہ اس کے لیے کوئی نام تجویز کریں۔ اقبال نے مشورہ دیا ''دیو محل'' رکھ لیں۔

اقبال کے استاد میر حسن کہیں جا رہے تھے۔ ان کے ساتھ ایک موٹا تازہ بچہ تھا جس کا نام احسان تھا۔ انھوں نے اقبال سے کہا کہ اُسے گود میں اٹھا لیں۔ وہ آگے آگے چلے گئے اور اقبال پیچھے رُکے رہے۔ میر حسن نے انھیں راستے میں ستاتے دیکھا تو کہا: اتنی برداشت بھی دشواری ہے؟ اقبال کے منہ سے نکلا: تیرا احسان بہت بھاری ہے

ذہین آدمی الفاظ سے خوب کھیلتا ہے اور پھر اگر وہ شاعر بھی ہو تو سونے پر سہاگہ ہوتا ہے۔ایک کشمیری خاندان کا فرد کسی دوسرے کفو میں شادی کرنا چاہتا تھا۔اقبال نے روکا تو وہ کہنے لگا آپ تو ذات پات کی تفریق مٹانے کی بات کرتے تھے! اقبال نے ہنس کر جواب دیا: تم خوب صورت کشمیری ہو۔غیر کفو میں شادی کرو گے تو اولاد کہیں کالی کلوٹی نہ پیدا ہو۔میں چاہتا ہوں مسلمانوں کے بچے بھی خوب صورت سرخ و سپید ہوں تاکہ ہم صحیح معنوں میں ''ملتِ بیضا'' بن جائیں۔'' نام نہاد ''لو جہاد'' والوں کے لیے لمحۂ فکر ہے۔

نصر اللہ خان صاحب نے اپنے ایک دوست کا تعارف کراتے ہوئے اقبال سے کہا: ذرا انہیں سمجھایئے۔یہ خدا کے وجود سے منکر ہیں''۔اس پر اقبال نے جواب دیا

''جس کو خدا نہ سمجھا سکا اسے میں کیا سمجھا سکتا ہوں۔''

اس مرحلے پر ایک لطیفہ اور سن لیجئے۔کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر مخدوم محی الدین کے کمیونسٹ دوست راج بہادر گوڑ سے ایک صاحب نے پوچھا: سنا ہے آپ خدا کے قائل نہیں۔راج بہادر گوڑ نے اثبات میں جواب دیا۔اس پر اُن صاحب نے پھر پوچھا کیا آپ واقعی خدا کو نہیں مانتے؟۔ اس پر راج بہادر گوڑ نے کہا:''ہاں بھئی خدا کی قسم میں خدا کو نہیں مانتا''۔

علامہ اقبال اپنے ابتدائی دور میں اکبر الہ آبادی سے اس قدر متاثر تھے کہ ان کے اسلوب کی پیروی تک کرنے لگے تھے۔بعض قطعات،اشعار پڑھ کر یہ تمیز کرنا دشوار ہوجاتا ہے کہ یہ اقبال کے ہیں یا اکبر کے۔جیسے

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی ڈھونڈ لی قوم نے فلاح کی راہ
روشِ مغربی ہے مدّ نظر وضعِ مشرق کو جانتے ہیں گناہ
یہ ڈرامہ دکھائے گا کیا سین پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

اقبال نے تقریباً ایک سو برس پہلے جو طنز کیا تھا آج کی صورتِ حال پر بھی پورا اترتا ہے۔

اکبرالہ آبادی نے بے پردہ بیبیوں پر چوٹ کی تھی اور ان کی بے پردگی کا ذمہ دار مرد کو ٹھیرایا تھا جن کی عقلوں پر پردہ پڑ گیا تھا۔ادھر علامہ اقبال Uni-culture کے متوالوں پر چوٹ چلتے ہیں:

شیخ صاحب بھی تو پردے کے کوئی حامی نہیں
مفت میں کالج کے لڑکے اُن سے بدظن ہو گئے
وعظ میں فرمادیا کل آپ نے یہ صاف صاف
پردہ آخر کس سے ہو جب مرد ہی زن ہو گئے

لمبی لمبی زلفیں رکھنے والے ،ہاتھوں میں چوڑیاں اور کانوں میں بالیاں پہننے والے لڑکوں پر اقبال کا طنز آج بھی کارگر ہے۔ایسے نوجوانوں سے بھلا کیا توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ ملک وملت کی رہنمائی کریں گے یا میدان کارزار کو پیٹھ نہیں دکھائیں گے۔

نام نہاد مسلم نوجوان پر اقبال کاری ضرب لگاتے ہیں۔اس کی جنسی فراخ دلی کو نادانی و بے چہرگی کا شناس نامہ قرار دیتے ہوئے اور غالب کے مصرعے سے استفادہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں

''اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے'' غالب کا قول سچ ہے تو پھر ذکرِ غیر کیا
کیوں اے جناب شیخ سنا آپ نے بھی کیا کہتے تھے کعبے والوں سے کل اہلِ دیر کیا
ہم پوچھتے ہیں مسلم عاشق مزاج سے الفت بتوں سے ہے تو برہمن سے بیر کیا؟

فلمی دنیا کے جتنے ''کھچڑی نسب'' خان ہیں کسی نہ کسی حسین کافرہ کی زلفوں کے اسیر ہیں۔ بُتِ طناز کے پجاری کو برہمن سے بھلا کیا بیر ہوسکتا ہے چنانچہ وہ نہ ادھر کے ہیں نہ ادھر کے ہیں۔

فلمی دنیا ہو کہ سیاسی دنیا۔ سماجی ہو کہ ثقافتی دنیا ہر جگہ ملی جلی تہذیب کے نمائندے نظر آتے ہیں۔ پہلے بھی تو اسلاف ''ولایتی مال'' گھر لے آتے تھے اب لوکل مال خانہ ساز پر گزارا کر لیتے ہیں۔

ظرافت محض خوش طبعی کو نہیں کہتے زیرکی کو بھی کہتے ہیں۔ ظریف جو ہوتا ہے وہ بذلہ سنج ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت زیرک بھی ہوتا ہے۔ تبھی تو Witty ہوتا ہے۔ غبی اور کند ذہن آدمی سے خوش سخنی اور اچھے کلمات کی توقع ہی نہیں ہوتی بلکہ اچھے فقرے اس پر ضائع بھی ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے تو وہ مذاق کا نشانہ بنا رہتا ہے۔ اقبال کی ظرافت میں ذہانت کارفرما ہے۔ نئی تہذیب سے کما حقہٗ واقف ہونے کے بعد ہی اس پر وہ چوٹ کر سکے۔

نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں

دو رکعت کے اماموں اور مفت کے مفتیوں کی وجہ سے جو نفرت اور تعصب کی فضا قائم ہوتی ہے وہ علامہ اقبال کے لیے قابل قبول نہیں۔ چنانچہ انھوں نے طنزیہ معنی خیز اشعار سے چوٹ کی کہ معاشرے کے لیے منفی فکر زہر سے کم نہیں۔

فرما رہے تھے شیخ طریقِ عمل پہ وعظ
کفّار ہند کے ہیں تجارت میں سخت کوش
مشرک ہیں وہ جو رکھتے ہیں مشرک سے لین دین
لیکن ہماری قوم ہے محرومِ عقل و ہوش
ناپاک چیز ہوتی ہے کافر کے ہاتھ کی
سن لے اگر ہے گوش مسلماں کا حق نیوش

اک بادہ کش بھی وعظ کی محفل میں تھا شریک
جس کے لیے نصیحتِ واعظ تھی بارِ گوش
کہنے لگا ستم ہے کہ ایسے قیود کی
پابند ہو تجارتِ سامانِ خورد ونوش
میں نے کہا کہ آپ کو مشکل نہیں کوئی
ہندوستاں میں ہیں کلمہ گو بھی مئے فروش

یہاں اقبال کا طنز دو دھاری ہے وہ جہاں معاشرے میں نفرت کی فضا پیدا کرنے والوں پر چوٹ کرتے ہیں وہیں کلمہ گو حضرات پر بھی طنز کرتے ہیں جو اسلام کا دعوا کرنے کے باوجود غیر اسلامی کاروبار میں مصروف ہیں اور مزے کی بات یہ کہ اس کے جواز پر اصرار بھی کرتے ہیں۔تاویلات سے یہ ثابت کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں نا جائز نہیں ہے۔اس کے جواز کے فتوے بھی وہ مفتیوں سے حاصل کر لیتے ہیں۔

اپنے ملک کی مصنوعات خریدنے کے بجائے غیر ملکی اشیا حاصل کرنے کا جنون Crazeایک زمانے سے رہا ہے ۔Made in England یا Made in Japan چیزیں آج بھی دل کو لبھاتی ہیں۔اس ذہنیت پر اقبال طنز کرتے ہیں

انتہا بھی اس کی ہے آخر خریدیں کب تلک
چھتریاں، رومال، مفلر، پیرہن جاپان سے
اپنی غفلت کی یہی حالت اگر قائم رہی
آئیں گے غسال کابل سے کفن جاپان سے

نئے نئے ٹیکسوں کی وجہ سے آج کا دیش بھکت گھریلو اشیا حاصل کرنے ہی میں پس وپیش کر رہا ہے بیرونِ ملک کی اشیا پر نظر ڈالنے کی شاید اس کی ہمت ہی نہ ہو۔

علامہ اقبال کا خاص اسلوب ہے کہ وہ دو کرداروں کے مابین مکالمہ قائم کر کے اپنی بات بڑے سلیقے سے رکھتے ہیں۔ شمع و پروانہ، جگنو و پروانہ، جبریل وابلیس وغیرہ۔ ان کا کلام ایسے دل چسپ مکالموں سے بھرا پڑا ہے۔ کچھ طنزیہ اشعار مالک و مُزارع کے حوالے سے ملاحظہ فرمایئے۔

تکرار تھی مزارع و مالک میں ایک روز
دونوں یہ کہہ رہے تھے مرا مال ہے زمیں
کہتا تھا وہ کرے جو زراعت اسی کا کھیت
کہتا تھا یہ کہ عقل ٹھکانے تری نہیں
پوچھا زمیں سے میں نے کہ ہے کس کا مال تو
بولی مجھے تو ہے فقط اس بات کا یقیں
مالک ہے یا مزارعِ شوریدہ حال ہے
جو زیرِ آسماں ہے وہ دھرتی کا مال ہے

دیکھیے کیسا دوٹوک فیصلہ ہے۔ جو کچھ ہے سب رزقِ خاک ہونے والا ہے۔ سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ۔

اقبال کے طنز کی کاٹ بڑی جان لیوا ہوتی ہے۔ وہ قلم کی نوک سے کچوکے لگانے میں ماہر ہیں۔ بے حسی انھیں گوارا نہیں۔ مختلف پیرایوں سے اقبال انسان کو موت وحیات کا فلسفہ سمجھانا چاہتے ہیں۔ وہ ہمدرد کے روپ میں دکھائی دیتے ہیں۔

کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ اب شیر بھی سامنے آجائے تو اتنا خوف نہیں ہوتا مگر ع

گائے پیچھے سے گزر جائے تو ڈر لگتا ہے۔

اقبال اپنے خاص اسلوب میں گائے اور اونٹ کے مابین مکالمے کے ذریعے یک جہتی کا پیام دیتے ہیں کہ دورنگی چھوڑ دے یک رنگ ہو جا۔ ظلم سے تو اونٹ بھی پناہ مانگتا ہے۔

گائے اک روز ہوئی اونٹ سے یوں گرم سخن
نہیں اک حال پہ دنیا میں کسی شئے کو قرار
میں تو بدنام ہوئی توڑ کے رسی اپنی
سنتی ہوں آپ نے بھی توڑ کے رکھ دی ہے مہار
ہند میں آپ تو ازروئے سیاست ہیں اہم
ریل چلنے سے مگر دشتِ عرب میں بے کار
کل تلک آپ کو تھا گائے کی محفل سے حذر
تھی لٹکتے ہوئے ہونٹوں پہ صدائے زنہار
آج یہ کیا ہے کہ ہم پر ہے عنایت اتنی
نہ رہا آئینہ ء دل میں وہ دیرینہ غبار
جب یہ تقریر سنی اونٹ نے شرما کے کہا
ہے ترے چاہنے والوں میں ہمارا بھی شمار
رشکِ صد غمزۂ اشتر ہے تری اک کلیل
ہم تو ہیں ایسی کلیلوں کے پرانے بیمار

تیرے ہنگاموں کی تاثیر یہ پھیلی بن میں
بے زبانوں میں بھی پیدا ہے مذاقِ گفتار
ایک ہی بن میں ہے مدت سے بسیرا اپنا
گرچہ کچھ پاس نہیں، چارہ بھی کھاتے ہیں ادھار
گو سفند و شتر و گا و پلنگ اور خرلنگ
ایک ہی رنگ میں رنگیں ہوں تو ہے اپنا وقار
باغباں ہو سبق آموز جو یک رنگی کا
ہم زباں ہو کے رہیں کیوں نہ طیورِ گل زار
دے وہی جام ہمیں بھی کہ مناسب ہے یہی
تو بھی سرشار ہو، تیرے رفقا بھی سرشار

اقبال کے نشانے پر ہر ریا کار اور بے عمل رہتا ہے۔ان کی زد کی تاب لانا مشکل ہوتا ہے جب وہ طنز کرتے ہیں:

مسجد تو بنادی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا

اقبال بڑا اُپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا یہ غازی تو بنا، کردار کا غازی بن نہ سکا

وہ اپنے آپ کو بھی نہیں بخشتے تو دنیا کو کیا بخشیں گے۔

نشان زد ظریفانہ کلام کے علاوہ اقبال کے سنجیدہ کلام میں بھی طنز کا عنصر غالب رہتا ہے۔خاص طور پر ضربِ کلیم کی چھوٹی چھوٹی نظمیں۔''جمہوریت'' پر اقبال کی رائے بھرپور طنز کی غماز ہے۔

اس راز کو اک مرد فرنگی نے کیا فاش
ہر چند کہ دانا اسے کھولا نہیں کرتے
جمہوریت اک طرز حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

بانگِ درا ہو کہ بال جبریل ،ضرب کلیم ہو کہ ارمغان حجاز اردو کلام ہو کہ فارسی علامہ اقبال کے اسلوب میں جگہ جگہ طنز ابھر کر سامنے آتا ہے: بال جبریل کی نظم ''باغی مرید'' میں اقبال سادہ لوح عقیدت مند کے حوالے سے عیار پیروں کی پول کھولتے ہیں۔

ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی
گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن !
شہری ہو دِہاتی ہو مسلمان ہے سادہ
مانندِ بُتاں پجتے ہیں کعبے کے برہمن
نذرانہ نہیں سود ہے پیرانِ حرم کا
ہر خرقہء سالوس کے اندر ہے مہاجن
میراث میں آئی ہے انھیں مسندِ ارشاد
زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن !

اس نظم میں اقبال کی ضرب مرید اور پیر دونوں پر پڑتی ہے ۔مٹی کے گھر میں مٹی کے دیے کے لیے تک محتاج مرید ہی تو پیر کے گھر کو بجلی کے قمقموں سے روشن کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ایسے خوش عقیدہ مرید قریوں دیہاتوں ہی میں نہیں بلکہ مہذب شہروں میں بھی پائے جاتے ہیں ۔جن کی وجہ سے سجادے خانقاہوں کے برہمن بنے ہوئے بتوں کی طرح پوجے جارہے ہیں۔ بے چارہ مرید ان کی قدم بوسی میں مگن ہے ۔انھیں نذرانے پیش کرنا سعادت سمجھتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض خوش عقیدہ اپنے روسیاہ پیر کو لال امپالا کار کا نذرانہ پیش کر کے سرخ رو ٹھیرتے ہیں۔اقبال ایسے ریا کار و مکار خرقہ پوش پیروں کو مہاجن سے تشبیہ دیتے ہیں جن کا گزارا سود پر ہوتا ہے ۔موروثی جائیداد کی طرح سجادگی نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتی رہتی ہے گویا عقابوں کے نشیمن بے حیثیت کووّں کے قبضے میں ہیں۔اقبال کی یہ نظم ان کی دردمندی کی مظہر ہے۔

نظم وغزل میں مثالیں بہت ہیں قطعات میں بھی اقبال کا طنز دیکھا جاسکتا ہے۔

محبت کا جنوں باقی نہیں ہے
مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے
صفیں کج ، دل پریشاں،سجدہ بے ذوق
کہ جذبِ اندروں باقی نہیں ہے

لالہء طور(پیام مشرق سے بھی ایک مثال پیش ہے جس میں طنز بڑا کاری ہے:

رمیدی از خدا و ندانِ افرنگ ولے بر گورو گنبد سجدہ پاشی
بہ لالائی چناں عادت گرفتی زِسنگِ راہ مولائے تراشی

خاکسار رؤف خیر نے اس کے منظوم ترجمے میں بھی اس کا تاثر برقرار رکھنے کی اپنی سی کوشش کی ہے۔

خدا وندونِ افرنگی سے بھاگا تو سجدہ گور و گنبد کا تراشا
غلامی کی پڑی عادت کچھ ایسی کہ ہر پتھر سے اک آقا تراشا

علامہ اقبال کا کمال ہے کہ ان کا ہر شعر چاہے وہ غزل کا ہو کہ نظم کا ایک اکائی کی طرح اپنی جگہ بے شمار معانی کی ایک دنیا لیے ہوئے ہوتا ہے جس میں طنز نمایاں رہتا ہے

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتا ہی

پیرِ حرم کو دیکھا ہے میں نے
کردار بے سوز ،گفتار واہی

اپنے من میں ڈوب کر پاجا سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن ،اپنا تو بن

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

زائرینِ کعبہ سے اقبال یہ پوچھے کوئی
کیا حرم کا تحفہ زم زم کے سوا کچھ بھی نہیں ؟

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ، ناپائیدار ہوگا

پیار محبت سے کہی ہوئی بات جب بے اثر ٹھیرتی ہے تو پھر طنزیہ پیرایہء اظہار اختیار کرنا لازمی ہوتا ہے۔اقبال نے یہی کچھ کیا ہے۔

''ارمغانِ حجاز'' میں 1936 میں لکھی ہوئی اقبال کی نظم ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'' بےعمل اور بدعمل مسلمانوں کی صورتِ حال پر اک شاہ کار طنز ہے جس کی کاٹ حساس ذہن و دل کو خون کے آنسو رلاتی ہے۔ ابلیس دنیا کے کسی بھی مذہب اور کسی بھی قائد کو خاطر ہی میں نہیں لاتا۔اُسے اپنی تباہی و بےوقاری کا اندیشہ ہے تو صرف اور صرف اسلام اور اس کے سچے پیرو مردِ مومن سے ہے۔ابلیس اپنے مشیروں سے اپنے کارنامے بیان کرتا ہے۔

میں نے دکھلایا فرنگی کو ملوکیّت کا خواب
میں نے توڑا مسجد و دیر و کلیسا کا فسوں
میں نے ناداروں کو سکھلایا سبق تقدیر کا
میں نے منعم کو دیا سرمایہ داری کا جنوں

اس کی کابینہ کا پہلا مشیر اس کی تائید کرتے ہوئے مزید فتوحات پر روشنی ڈالتا ہے۔

اس میں کیا شک ہے کہ محکم ہے یہ ابلیسی نظام
پختہ تر اس سے ہوئے خوئے غلامی میں عوام

ہے ازل سے ان غریبوں کے مقدر میں سجود
ان کی فطرت کا تقاضا ہے نمازِ بے قیا م
یہ ہماری سعیِ پیہم کی کرامت ہے کہ آج
صوفی و ملا ملوکیّت کے بندے ہیں تمام
طبع ِ مشرق کے لیے موزوں یہی افیون تھی
ورنہ قوالی سے کچھ کم تر نہیں "علم کلام"

اس مرحلے پر عرض ہے کہ بے چاری ملوکیّت مطلق العنانیت کے لیے خواہ مخواہ بدنام ہے۔کیا جمہوریت میں ملوکیت نہیں ہوتی۔کیا راتوں رات نوٹ بندی کے فیصلے سے خاص و عام پریشان نہیں ہوگئے تھے۔یہ اچانک فیصلہ ملک کے حق میں اچھا ہے یا بُرا اس پر ہم کچھ نہیں کہتے کہ مختلف طبقات کے مختلف احساسات ہیں۔یہ سیاست و معیشت کا معاملہ ہے جس پر ہمارا قلم کچھ لکھنے سے عاجز ہے۔

اس کا جواب اقبال ہی کی مذکورہ نظم کا مشیر یوں دیتا ہے۔

تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن ، اندروں چنگیز سے تاریک تر

پانچواں مشیر اپنے آقا ابلیس کی کارکردگی کی تعریف میں رطب اللسان یوں ہے:

فتنہء فردا کی ہیبت کا یہ عالم ہے کہ آج
کانپتے ہیں کوہ سار و مرغ زار و جوئے بار
میرے آقا وہ جہاں زیرو زبر ہونے کو ہے
جس جہاں کا ہے فقط تیری سیادت پر مدار

ابلیس اعظم، جہان رنگ و بو پر اپنے تصرفات گناتے ہوئے ڈینگ مارتا ہے۔

کیا امامانِ سیاست ، کیا کلیسا کے شیوخ
سب کو دیوانہ بنا سکتی ہے میری ایک ہو،
کیا ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد
یہ پریشاں روز گار ،آشفتہ مغز ،آشفتہ ہو ،
ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اُس اُمت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو
خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشکِ سحر گاہی سے جو ظالم وضو

ابلیس ایران سے نکلے ہوئے فتنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ایرانی مزدکیّت کے فتنے کی اُسے پروانہیں بلکہ اسلام کے فروغ سے خوف آتا ہے یہاں سے اقبال کا طنز عروج پر ہے۔وہ ابلیس کی زبانی امتِ مسلمہ کی زبوں حالی کا نقشہ کھینچتے ہیں:

جانتا ہوں میں یہ امتِ حاملِ قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں
عصر حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں

الحذر آئینِ پیغمبر سے سوبار الحذر
حافظِ ناموسِ زن ، مرد آزما ،مرد آفریں
ہے یہی بہتر الٰہیّات میں الجھا رہے
یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے

اس کے بعد ابلیسی ہتھکنڈوں کی شکار امت مسلمہ کے اختلافات کی ایک فہرست گناتے ہوئے ابلیس کے حوالے سے اقبال طنز کرتے ہیں کہ امت اسی میں الجھی ہوئی ہے کہ

''ابن مریم مرگیا یا زندۂ جاوید ہے؟''

کیوں کہ کچھ لوگوں نے مسیح موعود ہونے کا دعوا کیا۔

احمد بن حنبلؒ کے دور میں خلق قرآن کا فتنہ اٹھا تھا کہ

''ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم؟''

اسی قسم کے فتنوں میں ابلیس نے قوم کو الجھائے رکھا اور اقبال کی زبان میں ابلیس کا آخری حربہ ہے:

مست رکھو ذکر و فکر صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کردو مزاجِ خانقاہی میں اسے

''نسوانیتِ زن کا نگہباں ہے فقط مرد''

کہنے والے مظلومی نسواں سے غم ناک اقبال تعلیم نسواں پر اظہار خیال کرتے ہیں:

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت

علامہ اقبال کے سنجیدہ کلام میں بھی بین السطور اک طنز پایا جاتا ہے اور طنز بھی وہ بڑی سنجیدگی سے کرتے ہیں۔

اقبال کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے انہی کا شعر پیش ہے:

جو عالمِ ایجاد میں ہے صاحبِ ایجاد
ہر دور میں کرتا ہے طواف اس کا زمانہ



اصلی نام : محمد عبدالرؤف، قلمی نام : رؤف خیرؔ

ولدیت : محمد ابوبکر صاحب، تاریخ پیدائش :۵؍نومبر ۱۹۴۸ء، حیدرآباد

تعلیم :ایم اے۔اردو (عثمانیہ) ایم اے۔فارسی، پی ایچ ڈی اردو، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی) لکچرر اردو، موظف، حیدرآباد یونیورسٹی نے ''رؤف خیر شخصیت اور فن'' پر صبیحہ سلطانہ کو ایم فل کی ڈگری کا مستحق قرار دیا۔ ہندو پاک اور کل ہند شاعروں کے علاوہ انڈین ایمبسی کی دعوت پر جدہ، ریاض، مکہ اور مدینہ کے مشاعروں میں شرکت کی۔ تصنیفاتِ خیر:

(۱) اقراء ۱۹۷۷ء شعری مجموعہ

(۲) ایلاف ۱۹۸۲ء شعری مجموعہ

(۳) شہداب ۱۹۹۳ء شعری مجموعہ

(۴) حیدرآباد کی خانقاہیں ۱۹۹۴ء تحقیقی مقالہ

(۵) خطِ خیر ۱۹۹۷ء تنقیدی مضامین

(۶) قنطار ۲۰۰۱ء

(علامہ اقبال کے ۱۶۳ فارسی قطعات ''لالہ طور'' کا منظوم اردو ترجمہ)

(۷) سخن ملتوی ۲۰۰۴ء شعری مجموعہ

(۸) دکن کے رتن اور اربابِ فن ۲۰۰۵ء تنقیدی مضامین

(۹) بچشم خیر ۲۰۰۷ء تنقیدی مضامین

(۱۰) خیریات ۲۰۱۰ء شعری مجموعہ

(۱۱) حق گوئی و بے باکی ۲۰۱۳ء تنقیدی مضامین

(۱۲) دکن کی چند ہستیاں ۲۰۱۴ء تنقیدی مضامین

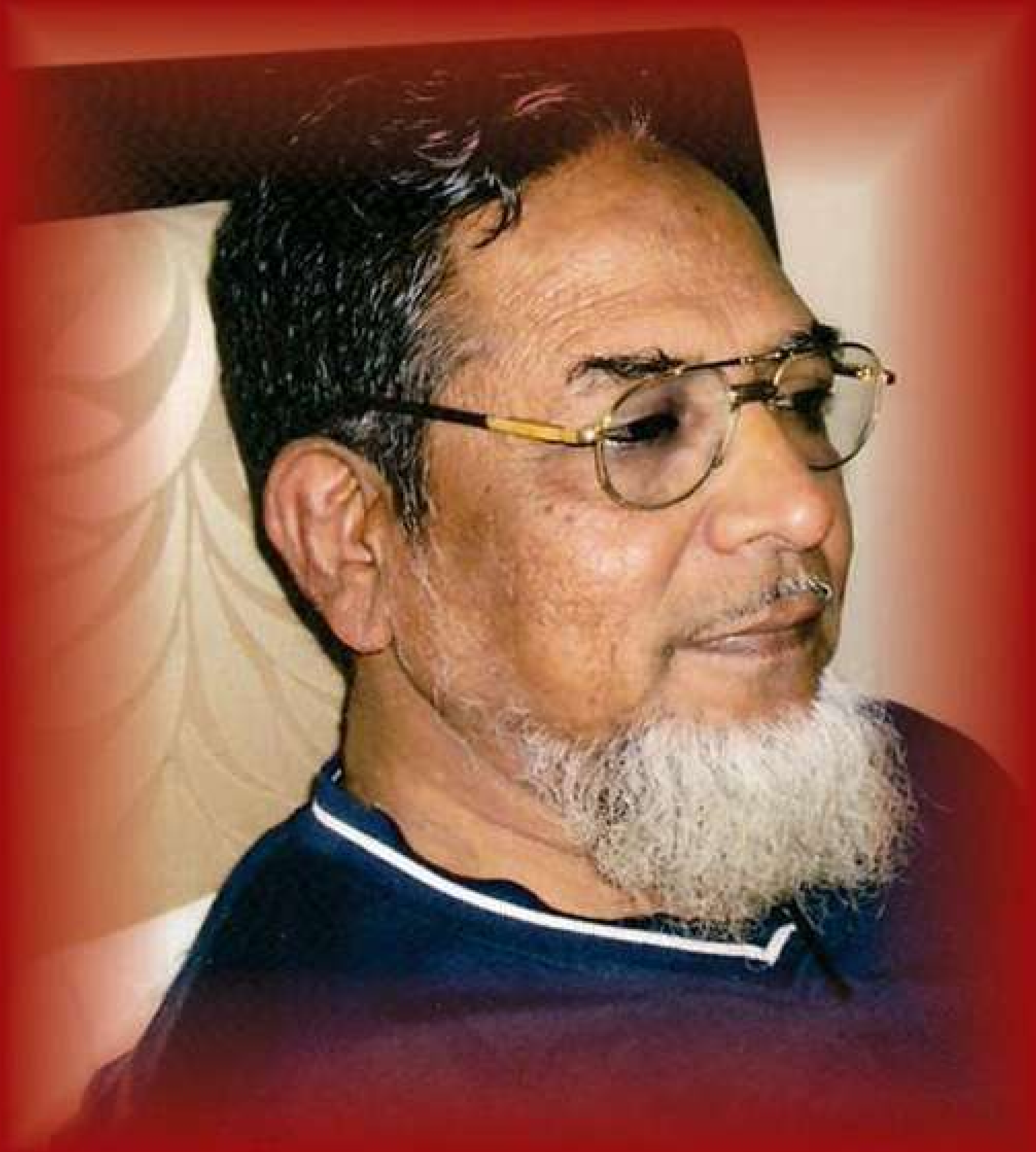
(۱۳) مشاہیر (خطوط کے حوالے سے) ۲۰۱۵ء تنقیدی مضامین

(۱۴) عزیز احمد قلم کارِ خوش قد ۲۰۱۶ء تنقید و تحقیق

IQBAL BA CHASHM E KHAIR

(Criticism)

BY : Dr. RAOOF KHAIR



DARUL ESHAAT-E-MUSTAFAI
3191, Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan
Delhi - 110006 (INDIA) , Ph: 011-23211540